فہرست

منظور الحسن

دہشت گردی ـــــ علما کی اصل ذمہ داری

مذہب کے نام پر دہشت گردی کے واقعات روز افزوں ہیں۔ اس دہشت گردی کے بارے میں یہ تصور عام ہے کہ یہ دینی علوم کی درس گاہوں میں جنم لیتی، مسجدوں اور امام بارگاہوں میں پروان چڑھتی اور پھر متشدد مذہبی تنظیموں کی شکل میں ملک کے کونے کونے میں پھیل جاتی ہے۔ منبروں اور جلسہ گاہوں سے کفر کے فتوے صادر ہوتے ہیں، واجب القتل کے نعرے لگتے ہیں اور مخالف نظریات کو ان کے حاملین سمیت صفحۂ ہستی سے مٹا دینے کے عزائم ظاہر کیے جاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ عبادت گاہیں اللہ کی یاد میں کھڑے ہونے والوں کے لہو سے رنگین ہوتی اور مذہبی رہنماؤں کے ساتھ عام شہری بھی بموں کا ایندھن بن جاتے ہیں۔

اس اندوہ ناک صورت حال کا ایک بڑا محرک بعض مذہبی علما کا تشدد پسندانہ رویہ ہے۔ فرقہ پرستی، مخالف مکتب فکر کے حاملین کی تکفیر کے فتوے اور ان کے وجود کو برداشت نہ کر سکنے کے جذبات اس متشدد رویے کا باعث بنتے ہیں۔ چنانچہ اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ اس صورت حال کی ذمہ داری بنیادی طور پر علماے دین پر عائد ہوتی ہے تو اس کی بات کو غلط نہیں کہا جا سکتا۔ بظاہر ایسے معلوم ہوتا ہے کہ دین نے علما پر جو ذمہ داری عائد کی تھی، وہ اس سے نہ صرف دست بردار ہو گئے ہیں، بلکہ اس سے انحراف کی سطح پر آ کر کھڑے ہو گئے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے علما پر جو ذمہ داری عائد کی ہے، وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ وہ لوگوں کو ''انذار'' کریں، یعنی آخرت کے عذاب سے خبردار کریں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

> ''اور سب مسلمانوں کے لیے تو یہ ممکن نہ تھا کہ وہ اس کام کے لیے نکل کھڑے ہوتے، لیکن ایسا کیوں نہ ہوا کہ ان کے ہر گروہ میں سے کچھ لوگ نکل کر آتے تاکہ دین میں بصیرت حاصل کرتے اور اپنی قوم کے لوگوں کو انذار کرتے،

جب (علم حاصل کر لینے کے بعد) اُن کی طرف لوٹتے، اس لیے کہ وہ بچتے۔'' (التوبہ ۹: ۱۲۲)

انذار کی اس عظیم ذمہ داری کا تقاضا ہے کہ علما لوگوں کو شرک کی آلایشوں سے بچا کر توحید کی صراطِ مستقیم پر گامزن کرنے کی کوشش کریں، انھیں نبوت و رسالت کے حقائق سے آگاہ کریں اور پیغمبر آخر الزماں کے اسوۂ حسنہ کی پیروی کے لیے ان کی تربیت کا اہتمام کریں۔ آخرت پر ان کے ایمان کو مستحکم کرنے کی سعی کریں اور انھیں دوزخ کے عذاب سے ڈرائیں۔ انھیں بتائیں کہ یہ دنیا محض ایک آزمایش گاہ ہے، جسے ایک روز ختم ہو جانا ہے۔ اس دنیا میں انسان کو اس لیے بھیجا گیا ہے کہ اللہ کی بنائی ہوئی ابدی دنیا کے لیے صالح نفوس کو تیار کیا جا سکے، اللہ کی قائم کردہ حدود کا پاس کرنے والوں اور ان کو توڑنے والوں میں امتیاز کیا جا سکے۔ اس کے فرماں برداروں اور اس سے سرکشی کرنے والوں کو الگ الگ کیا جا سکے اور پھر پاک نفس والے مطیع انسانوں سے جنت کو بسایا جائے اور آلودہ نفس والے سرکش انسانوں کو دوزخ کا ایندھن بنا دیا جائے۔ ان حقائق کی مسلسل تذکیر و نصیحت کے ساتھ ساتھ قرآن و سنت کی جملہ تعلیمات سے لوگوں کو آگاہی علما کی اصل ذمہ داری ہے۔

اس ذمہ داری کو ادا کرتے وقت انھیں اس معاملے میں اللہ تعالیٰ کی قائم کردہ حدود کا لازماً پاس کرنا چاہیے۔ اس ضمن میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو تذکیر و نصیحت اور یاددہانی ہی تک محدود رکھیں، اس سے آگے بڑھ کر دھونس اور زبردستی کی اللہ تعالیٰ نے کوئی گنجایش نہیں دی۔ اللہ تعالیٰ نے یہ گنجایش اگر دینی ہی ہوتی تو ان ہستیوں کو دیتے جو اپنی ذات کے تزکیے میں سب سے اعلیٰ مقام پر فائز تھیں۔ لوگوں کی اخروی نجات کے لیے جن کی تڑپ بے کراں تھی، جن کی بات بلاغ مبین تھی اور جن سے خدا براہِ راست کلام کرتا تھا، ان برگزیدہ ہستیوں کو تو واضح طور پر یہ کہہ دیا گیا کہ:

''تم یاددہانی کیے جاؤ۔ تم بس یاددہانی کرنے والے ہو۔ تم ان پر کوئی داروغہ نہیں ہو۔'' (الغاشیہ ۸۸: ۲۱-۲۲)

''تم جن کو چاہو انھیں ہدایت نہیں دے سکتے، بلکہ اللہ ہی جنھیں چاہتا ہے (اپنے قانون کے مطابق) ہدایت دیتا ہے۔ اور وہی بہتر جانتا ہے ان کو جو ہدایت پانے والے ہیں۔'' (القصص ۲۸: ۵۶)

''تم اگر ان کی ہدایت کے لیے حریص ہو تو اللہ ان کو ہدایت نہیں دیا کرتا، جنھیں وہ (اپنے قانون کے مطابق) گمراہ کر دیتا ہے، اور اس طرح کے لوگوں کا کوئی مددگار نہیں ہوتا۔'' (النحل ۱۶: ۳۷)

ظاہر ہے کہ اگر انبیا کا کام محض تذکیر و یاددہانی تک محدود ہے تو ان کی اتباع میں کھڑے علما اس سے آگے کیونکر بڑھ سکتے ہیں، ان کا کام تو بس یہی ہے کہ قرآن و سنت کے پیغام کو اپنی بہترین صلاحیتیں صرف کرتے ہوئے لوگوں

تک پہنچا دیں۔ ان کی زبان شیریں ہو، ان کا استدلال مضبوط ہو، ان کا انداز خیر خواہانہ ہو، ان کی تنقید شایستہ ہو۔ دعوت کا یہ اسلوب ہی دلوں میں گھر کرتا اور بنجر زمینوں میں بھی روئیدگی کے آثار پیدا کر دیتا ہے۔ یہ اسلوب اختیار کر لینے کے بعد پھر اس کی ضرورت نہیں رہتی کہ نظریاتی مخالفین کے وجود کو مٹا دیا جائے، بلکہ اگر اللہ کو منظور ہو تو مخالفین کا وجود آہستہ آہستہ ان کے لیے سراپا نصرت وتعاون بن جاتا ہے۔

لیکن یہ شاید پوری امت کا المیہ ہے کہ دین کے علم بردار اپنی اصل ذمہ داری سے گریز پا نظر آتے ہیں۔ ایسے معلوم ہوتا ہے کہ دین کی تعلیم وتربیت اور آخرت کی جواب دہی کے لیے لوگوں کو انذار اب ان کا مسئلہ ہی نہیں رہا۔ اس کے بجائے انھوں نے اپنے لیے جو کام منتخب کیے ہیں، وہ سرتاسر یہی ہیں کہ اپنے نظریاتی مخالفین کے خلاف سادہ لوح لوگوں کو مشتعل کیا جائے۔ ان کی تکفیر کے فتوے صادر کیے جائیں اور انھیں واجب القتل ٹھہرایا جائے۔

اس سارے رویے میں علما، دین کی اس حقیقت کو بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں کہ اس دنیا میں کسی شخص یا گروہ کے بارے میں زیادہ سے زیادہ یہ فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ قانونی اعتبار سے مسلمان ہے یا غیر مسلم، لیکن جہاں تک حقیقی ایمان کا تعلق ہے تو اس کا فیصلہ اللہ تعالیٰ ہی کر سکتے ہیں۔ دلوں میں جھانکنے کی نہ ہم صلاحیت رکھتے ہیں اور نہ ہمیں اس کی سعی کرنی چاہیے۔ چنانچہ قرآن مجید کی رو سے قانونی اعتبار سے ہر وہ شخص مسلمان قرار پائے گا جو زبان سے اسلام کے عقائد کا اقرار کرتا، نماز قائم کرتا اور زکوٰۃ ادا کرتا ہے۔ علما اگر کسی شخص یا گروہ کے نظریات کو غلط سمجھتے ہیں تو انھیں چاہیے کہ وہ نظریات کی غلطی کو علمی سطح پر واضح کریں اور دردمندانہ تذکیر ونصیحت سے اسے راہ راست پر لانے کی کوشش کریں۔ ان کے لیے صحیح لائحۂ عمل یہی ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ النساء

(۲۰)

(گزشتہ سے پیوستہ)

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا، كُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ، وَلَوْ عَلٰۤی اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ، اِنْ یَّكُنْ غَنِیًّا اَوْ فَقِیْرًا، فَاللّٰهُ اَوْلٰی بِهِمَا، فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰۤی

ایمان[۲۱۰] والو، انصاف پر قائم رہو، اللہ کے لیے اُس کی گواہی دیتے ہوئے[۲۱۱]، اگرچہ یہ گواہی خود تمھاری ذات، تمھارے ماں باپ اور تمھارے قرابت مندوں کے خلاف ہی پڑے۔ امیر ہو یا غریب، اللہ ہی دونوں کے لیے زیادہ حق دار ہے، اِس لیے (خدا کی ہدایت کو چھوڑ کر) تم خواہشوں کی پیروی نہ کرو کہ

[۲۱۰] یتیموں کی ماؤں سے نکاح کے بارے میں استفتا کا جواب پچھلی آیت پر ختم ہوا۔ یہاں سے آگے آیت ۱۵۲ تک اب اُن لوگوں کے خیالات پر تبصرہ ہے جو دوستی، تعلقات اور رشتہ و پیوند کو حق کے مقابلے میں ترجیح دیتے اور منکرین کے ہاں اپنے مقام و مرتبہ اور اپنی حیثیت کو برقرار رکھنے کے لیے بار بار پوچھتے تھے کہ بیچ کی راہ تلاش کر لینے میں آخر حرج ہی کیا ہے؟ یہ کیوں ضروری ہے کہ اہل کتاب کے منکرین کو بھی اُنھی کافروں کی صف میں کھڑا کیا جائے جنھیں قرآن عذاب الٰہی کا مستحق قرار دے رہا ہے؟ اُن کا خیال تھا کہ اہل کتاب بہت کچھ مانتے ہیں۔ اِس کی رعایت سے اُن کے ساتھ رعایت ہونی چاہیے؟ اِس سورہ کے مباحث سے متعلق اِس طرح کے سوالات اُن کے ذہنوں میں پیدا ہوتے تھے۔ قرآن نے اِن کے جواب میں پوری وضاحت کے ساتھ بتایا ہے کہ اِس کا کوئی امکان

اَنۡ تَعۡدِلُوۡا وَاِنۡ تَلۡوٗۤا اَوۡ تُعۡرِضُوۡا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِيۡرًا ﴿۱۳۵﴾ يٰۤاَيُّهَا
الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا، اٰمِنُوۡا بِاللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖ وَالۡكِتٰبِ الَّذِىۡ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوۡلِهٖ وَالۡكِتٰبِ
الَّذِىۡۤ اَنۡزَلَ مِنۡ قَبۡلُ، وَمَنۡ يَّكۡفُرۡ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ

اِس کے نتیجے میں حق سے ہٹ جاؤ اور (یاد رکھو کہ) اگر (حق و انصاف کی بات کو) بگاڑنے یا (اُس سے) پہلو بچانے کی کوشش کرو گے[۲۱۲] تو جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اُس سے خوب واقف ہے۔ ایمان والو، اللہ پر ایمان لاؤ[۲۱۳] اور اُس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اُس کتاب پر جو اُس نے اپنے رسول پر نازل کی ہے اور اُس کتاب پر بھی جو وہ اِس سے پہلے نازل کر چکا ہے[۲۱۴] اور (جان رکھو کہ) جو اللہ اور اُس کے

نہیں ہے۔ اِس لیے کہ کفر صرف یہ نہیں ہے کہ کوئی شخص صریح الفاظ میں اللہ اور اُس کے رسولوں کا انکار کرے، کفر اور صریح کفر یہ بھی ہے کہ اللہ اور اُس کے رسولوں کو اللہ کے شرائط پر نہیں، بلکہ اپنے شرائط پر ماننے کے لیے اصرار کیا جائے۔ چنانچہ خدا کا فیصلہ سننا چاہتے ہو تو سن لو کہ تمھیں ہر حال میں حق کہنا ہے، حق کی گواہی دینی ہے اور پورے دین کو بے کم و کاست جس طرح کہ وہ ہے، قبول کرنا ہے۔ اِس کے سوا ہر رویہ منافقت کا رویہ ہے اور منافقت اور کفر میں اللہ کے نزدیک کوئی فرق نہیں ہے۔

[۲۱۱] یعنی مجرد یہی نہیں کہ تمھیں حق و انصاف پر قائم رہنا ہے، بلکہ دوسروں کے سامنے اِس کی گواہی بھی دینی ہے۔

[۲۱۲] یعنی اُس سے گریز و فرار کی کوئی راہ تلاش کرنے کی کوشش کرو گے۔

[۲۱۳] اصل الفاظ ہیں: 'يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا، اٰمِنُوۡا'۔ ان میں پہلا فعل اپنے ابتدائی اور دوسرا کامل معنی میں استعمال ہوا ہے۔ یعنی ایمان کا دعویٰ کرنے والو، اللہ پر ایمان لاؤ جس طرح کہ ایمان لانے کا حق ہے۔

[۲۱۴] اِس آیت میں تورات کے لیے 'اَنۡزَلَ' اور قرآن کے لیے 'نَزَّلَ' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اِس کی وجہ کیا ہے؟ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...جو لوگ عربی زبان کی باریکیوں سے واقف ہیں، وہ جانتے ہیں کہ 'اَنۡزَلَ' کا مفہوم تو مجرد اتار دینا ہے، لیکن 'نَزَّلَ' کے اندر اہتمام اور تدریج کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے۔ لفظوں کا یہ فرق تورات اور قرآن، دونوں کے اُتارے جانے کی نوعیت کو واضح کر رہا ہے۔'' (تدبر قرآن ۲/۴۰۸)

فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِيْدًا ﴿۱۳۶﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ
ازْدَادُوْا كُفْرًا، لَّمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ سَبِيْلًا ﴿۱۳۷﴾ بَشِّرِ
الْمُنٰفِقِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۱۳۸﴾ الَّذِيْنَ يَتَّخِذُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ
الْمُؤْمِنِيْنَ، اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ، فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ﴿۱۳۹﴾
وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَاُ
بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ، حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖٓ، اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ، اِنَّ

فرشتوں اور اُس کی کتابوں اور اُس کے رسولوں اور اُس کے حضور میں پیشی کے دن کے منکر ہوں، وہ بہت دور کی گمراہی میں جا پڑے ہیں۔ رہے وہ لوگ جو ایمان لائے، پھر کفر کیا، پھر ایمان لائے، پھر کفر کیا، پھر اِسی کفر میں بڑھتے چلے گئے[۲۱۵]، تو اللہ نہ اُن کی مغفرت کرنے والا ہے اور نہ اُنھیں کبھی راہ دکھائے گا۔ اِن منافقوں کو خوش خبری دو، (اے پیغمبر)، جو ایمان والوں کو چھوڑ کر (تمھارے) منکرین کو اپنا دوست بنائے ہوئے ہیں کہ اِن کے لیے ایک دردناک عذاب ہے۔ یہ اُن کے ہاں عزت چاہتے ہیں؟ (حقیقت یہ ہے کہ) عزت تو تمام تر اللہ ہی کے لیے ہے۔ ۱۳۵-۱۳۹

وہ اِسی کتاب میں تم پر یہ ہدایت نازل کر چکا ہے کہ جہاں تم سنو کہ آیات الٰہی کا انکار کیا جا رہا ہے اور اُن کا مذاق اڑایا جا رہا ہے، وہاں اُن (مذاق اڑانے والوں) کے ساتھ نہ بیٹھو جب تک وہ کسی دوسری بات میں نہ لگ جائیں، ورنہ تم بھی اُنھی کی طرح ہو جاؤ گے[۲۱۶]۔ اللہ کا فیصلہ ہے کہ وہ اِس طرح

---

[۲۱۵] یہ بیان واقعہ ہے۔ اِس کی صورت یہ تھی کہ یہ لوگ آگے بڑھ کر ایمان کا اقرار کرتے اور اِس کے بعد قرآن، اسلام اور پیغمبر کے خلاف سازشوں میں مصروف ہو جاتے تھے۔ اِن کے اِسی رویے کو یہاں کفر سے تعبیر کیا ہے۔

[۲۱۶] یہ سورۂ انعام (۶) کی آیت ۶۸ کا حوالہ ہے جس میں ہدایت کی گئی ہے کہ جب لوگ اللہ کی آیتوں میں کج بحثیاں کر رہے ہوں تو اُن ظالموں کے پاس نہ بیٹھو، یہاں تک کہ وہ کسی اور بات میں لگ جائیں۔ استاذ امام

اللّٰہَ جَامِعُ الْمُنٰفِقِیْنَ وَالْکٰفِرِیْنَ فِیْ جَھَنَّمَ جَمِیْعًا ﴿۱۴۰﴾ الَّذِیْنَ یَتَرَبَّصُوْنَ بِکُمْ، فَاِنْ کَانَ لَکُمْ فَتْحٌ مِّنَ اللّٰہِ، قَالُوْٓا: اَلَمْ نَکُنْ مَّعَکُمْ، وَاِنْ کَانَ لِلْکٰفِرِیْنَ نَصِیْبٌ، قَالُوْٓا: اَلَمْ نَسْتَحْوِذْ عَلَیْکُمْ وَنَمْنَعْکُمْ مِّنَ الْمُؤْمِنِیْنَ، فَاللّٰہُ یَحْکُمُ بَیْنَکُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ وَلَنْ یَّجْعَلَ اللّٰہُ لِلْکٰفِرِیْنَ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ سَبِیْلًا ﴿۱۴۱﴾

کے منافقوں اور منکروں کو جہنم میں ایک ہی جگہ جمع کر دے گا، اِن کو جو تمھارے لیے گردشوں کے منتظر ہیں[۲۱۷]۔ چنانچہ اللہ کی طرف سے تمھاری کوئی فتح ہوتی ہے تو کہتے ہیں کہ کیا ہم تمھارے ساتھ نہ تھے؟ اور اگر تمھارے منکروں کی جیت ہو جائے تو کہتے ہیں کہ کیا ہم تمھیں گھیرے میں لیے ہوئے نہیں رہے اور ہم نے مسلمانوں سے تم کو بچایا نہیں ہے؟ سو تمھارے درمیان اب اللہ ہی قیامت کے دن فیصلہ کرے گا اور اللہ (کا فیصلہ ہے کہ وہ) اِن منکروں کو ایمان والوں کے خلاف ہرگز کوئی راہ نہ دے گا[۲۱۸]۔ ۱۴۰-۱۴۱

لکھتے ہیں:

''جن مجلسوں میں اللہ کے دین اور اُس کی شریعت کا تہتک ہو، اُن میں اگر کوئی مسلمان شریک ہو تو یہ اُس کی بے حمیتی اور بے غیرتی کی دلیل ہے۔ اگر کوئی شخص اِن میں شرکت کو اپنے لیے وجہ عزت و شرف سمجھے تو یہ صرف بے حمیتی کی ہی نہیں، بلکہ اُس کے مسلوب الایمان ہونے کی بھی دلیل ہے۔ اِس قسم کے منافقوں کا حشر اُنھی لوگوں کے ساتھ ہو گا جن کے ساتھ خدا کے دین کے استہزا میں یہ شریک رہے ہیں۔'' (تدبر قرآن ۲/ ۴۱۰)

[۲۱۷] اصل میں 'یَتَرَبَّصُوْنَ بِکُمْ' کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ عربی زبان کا محاورہ ہے، یعنی 'یَتَرَبَّصُوْنَ بِکُمُ الدَّوَآئِرَ'۔

[۲۱۸] یعنی اُس دن تمھارے مقابل میں اِن کی کوئی پیش نہ جائے گی اور جس طرح یہ لوگ یہاں 'اَلَمْ نَکُنْ مَّعَکُمْ' (کیا ہم تمھارے ساتھ نہ تھے) کہنے کی جسارت کرتے ہیں، وہاں اِس کا تصور بھی نہ کر سکیں گے۔

[باقی]

محمد رفیع مفتی

نذر قسم ہی ہے

رُوِیَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ: إِنَّمَا النَّذْرُ یَمِیْنٌ، کَفَّارَتُھَا کَفَّارَۃُ الْیَمِیْنِ.

نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ روایت کیا گیا ہے کہ آپ نے فرمایا : نذر تو بس قسم ہی ہے، اس کا کفارہ وہی ہے جو قسم کا کفارہ ہے۔

ترجمے کے حواشی

نذر اپنی حقیقت میں وہی چیز ہے جو قسم ہے۔ قسم کھانے والا اپنی بات یا اپنے عہد پر خدا کو گواہ بناتا ہے اور نذر ماننے والا اللہ کے ساتھ کوئی عہد کرتا ہے۔ دونوں میں خدا کے ساتھ عہد کا یہ اشتراک انھیں ہم مثل بنا دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نذر کا کفارہ وہی بیان کیا گیا ہے جو قسم کا کفارہ ہے۔

متن کے حواشی

۱۔ یہ احمد بن حنبل کی روایت، رقم ۱۷۳۸۷ ہے۔ بعض اختلافات کے ساتھ یہ مضمون یا اس کے کچھ حصے حسب ذیل (۱۲) مقامات پر نقل ہوئے ہیں:

احمد بن حنبل، رقم ۱۷۳۳۹، ۱۷۳۵۷، ۱۷۳۶۳، ۱۷۴۵۹؛ مسلم، رقم ۱۶۴۵؛ بیہقی، رقم ۱۹۶۹۷، ۱۹۸۶۲، ۱۹۸۳۵؛ ابوداؤد، رقم ۳۳۲۳، ۳۳۲۴؛ نسائی، رقم ۳۸۳۲؛ ابویعلیٰ، رقم ۱۷۴۴۔

بعض روایات مثلاً احمد بن حنبل، رقم ۱۷۳۳۹ میں 'إِنَّمَا النَّذْرُ يَمِينٌ كَفَّارَتُهَا' (نذر تو بس قسم ہی ہے، اس کا کفارہ) کے بجائے 'كَفَّارَةُ النَّذْرِ' (نذر کا کفارہ) کے الفاظ اور بعض روایات مثلاً احمد بن حنبل، رقم ۱۷۴۵۹ میں 'إِنَّمَا النَّذْرُ كَفَّارَتُهُ' (نذر، اس کا کفارہ تو) کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

بعض روایات مثلاً بیہقی، رقم ۱۹۶۹۷ میں متعلق الفاظ سے پہلے الگ سند کے ساتھ 'مَنْ نَذَرَ نَذْرًا لَمْ يُسَمِّهِ فَكَفَّارَتُهُ كَفَّارَةُ يَمِينٍ' (جس نے کوئی غیر متعین نذر مانی تو اس کا کفارہ وہی ہو گا جو قسم کا کفارہ ہے) کے الفاظ بھی روایت ہوئے ہیں۔

بعض روایات مثلاً ابویعلیٰ، رقم ۱۷۴۴ میں 'إِنَّمَا النَّذْرُ يَمِينٌ كَفَّارَتُهَا كَفَّارَةُ الْيَمِينِ' (نذر تو بس قسم ہی ہے، اس کا کفارہ وہی ہے جو قسم کا کفارہ ہے) کے بجائے 'اَلنَّذْرُ يَمِينٌ وَكَفَّارَتُهُ كَفَّارَةُ يَمِينٍ' (نذر قسم ہے اور اس کا کفارہ وہی ہے جو قسم کا کفارہ ہے) کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

ساجد حمید

حلال مردار اور حلال خون

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: أُحِلَّتْ لَكُمْ مَيْتَتَانِ وَدَمَانِ فَأَمَّا الْمَيْتَتَانِ فَالْحُوْتُ وَالْجَرَادُ وَأَمَّا الدَّمَانِ فَالْكَبِدُ وَالطِّحَالُ[1]. (سنن ابن ماجہ، رقم ۳۳۱۴)

عبد اللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما) سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمھارے لیے دو مردار اور دو خون حلال رکھے گئے ہیں، دو مردار یہ ہیں: مچھلی اور ٹڈی[1]، جبکہ دو خون کلیجی اور تلی ہیں[2]۔

ترجمے کے حواشی

۱۔ پچھلی روایتوں میں ہم یہ عرض کر چکے ہیں کہ 'میتة' کا لفظ عرب مردہ مچھلی اور مردہ ٹڈی پر نہیں بولتے تھے، اس لیے یہ چیزیں خود بخود اس سے مستثنیٰ ہو جائیں گی۔ دوسرے یہ کہ جانور کے مردہ اور ذبح ہونے میں صرف یہی فرق ہے کہ ذبح کرنے سے اس کا خون بہ گیا ہوتا ہے۔ چنانچہ جس جانور میں خون ہی نہ ہو، اس میں اور ذبح شدہ جانور میں اصلاً کوئی فرق نہیں ہے۔ چونکہ ٹڈی اور مچھلی میں خون نہیں ہوتا، اس لیے وہ ذبح کی محتاج نہیں ہیں۔ چنانچہ ان کو ہم مردہ حالت میں پا کر بھی کھا سکتے ہیں۔

۲۔ اوپر والے اصول ہی کے تحت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تلی اور کلیجی کو خون کی حرمت سے مستثنیٰ کیا ہے۔

حقیقت میں تو دونوں خون کی بنی ہوئی دکھائی دیتی ہیں، لیکن چونکہ خون کے معنی میں تلی اور کلیجی شامل نہیں ہے، اس لیے وہ حرام نہیں ہوں گی۔ ویسے بھی قرآن مجید نے 'دم مسفوح' (بہتا خون) کہہ کر اس اشتباہ کو بھی دور کر دیا ہے کہ خون سے مراد وہ خون ہے جو بہ کر جانور کے جسم سے نکلتا ہے۔ اسے کسی صورت میں بھی نہیں کھایا پیا جا سکتا۔ چونکہ تلی اور کلیجی میں خون اس صورت میں نہیں، بلکہ بوٹی کی صورت میں ہے، اس لیے وہ اس سے مستثنیٰ رہے گا۔

متن کے حواشی

یہ روایت ان مقامات پر انھی الفاظ میں آئی ہے: سنن ابن ماجہ، رقم ۳۳۱۴؛ مسند الامام احمد بن حنبل، رقم ۵۷۲۳؛ سنن البیہقی الکبریٰ، رقم ۱۱۲۹، ۱۹۴۸۱۔ البتہ یہی مضمون جملے کی مختلف ساخت کے ساتھ بھی آیا ہے: سنن البیہقی الکبریٰ، رقم ۱۱۲۸ میں جملہ یوں ہے: 'أُحِلَّتْ لَنَا مَيْتَتَانِ وَدَمَانِ الْجَرَادُ وَالْحِيتَانُ وَالْكَبِدُ وَالطِّحَالُ'. اور اسی کتاب کی رقم ۱۸۷۷۶ کے تحت جملہ یوں ہے: 'أُحِلَّتْ لَنَا مَيْتَتَانِ وَدَمَانِ الْمَيْتَتَانِ الْحُوتُ وَالْجَرَادُ وَالدَّمَانِ أَحْسِبُهُ قَالَ الْكَبِدُ وَالطِّحَالُ'، جبکہ سنن ابن ماجہ، رقم ۳۲۱۸ میں بس یہ الفاظ ہیں: 'أُحِلَّتْ لَنَا مَيْتَتَانِ الْحُوتُ وَالْجَرَادُ'۔

پروفیسر خورشید عالم

قاہرہ میں چند روز ــــ علمی مشاہدات

[''نقطۂ نظر'' کا یہ کالم مختلف اصحاب فکر کی نگارشات کے لیے مختص ہے۔ اس میں شائع ہونے والے مضامین سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

ـــــــ ۲ ـــــــ

حجری ستون

Dennis Bratcher کہتا ہے:

''حجری ستون میں پہلی دفعہ لفظ اسرائیل کا تذکرہ ہوا۔ علما اس نتیجے تک پہنچے ہیں کہ اسرائیلی مرنفتاح کے عہد حکومت تک کنعان میں جم کر آباد ہو چکے تھے، کیونکہ اس عبارت میں اسرائیل کا اسی طریقے سے ذکر ہے۔''

علامہ عبداللہ یوسف علی سورۂ اعراف کے آخر میں ضمیمہ چہارم کے صفحہ ۴۰۶ پر لکھتے ہیں:

''مصریات میں حضرت یوسف اور حضرت موسیٰ علیہما السلام کا کوئی حوالہ نہیں ملتا۔ اسرائیل کے بارے میں واحد حوالہ مرنفتاح یا منفتاح (۱۲۲۵ قبل از مسیح) میں ملتا ہے۔ یہ حوالہ فلسطین میں اسرائیلیوں کے بارے میں ہے نہ کہ مصر میں اسرائیلیوں کے بارے میں... پہلے یقینی نقطۂ نظر یہی معلوم ہوتا تھا کہ رمسیس ثانی اسرائیلیوں کو عذاب میں مبتلا کرنے والا فرعون تھا اور اس کا بیٹا مرنفتاح (منفتاح) خروج کے وقت تعاقب کرنے والا... مگر یہ تاریخ بہت بعد کی معلوم ہوتی ہے۔ اب دلائل اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ اسرائیلی پہلے ہی کنعان میں آباد ہو چکے تھے۔''

انھوں نے کتاب مقدس کی مذکورہ بالا روایت کے مطابق تحتمس اول (Tuthomosis i) (۱۵۴۰ قبل از مسیح) کو عذاب دینے اور تعاقب کرنے والا قرار دیا ہے جس کی اوپر تردید کی جا چکی ہے۔

اس نقطۂ نظر کے سب سے بڑے مؤید ''بائیبل ،قرآن اور سائنس'' کے مصنف نے اس بات کو ثابت کرنے کے لیے بڑا زور مارا ہے کہ حجری ستون میں مذکور لفظ اسرائیل ایک عام اصطلاح ہے، کسی علاقے سے مخصوص نہیں اور یہ کہ کنعان میں خروج سے پہلے بھی اسرائیلی آباد تھے، مگر بات بنی نہیں، وہ حجری ستون میں مذکور تاریخی حقائق کو خاص طور پر یہودی انسائیکلو پیڈیا میں مذکور عبارت کو جھٹلا نہیں سکے۔ رہی بائیبل کی وہ روایت کہ موسیٰ علیہ السلام مدین میں تھے جب مصر کا فرعون مر گیا تو Father de vaux اپنی کتاب ''The Ancient History of Israel'' میں اس روایت کو قابل اعتبار نہیں سمجھتے۔ بنو اسرائیل کی نجات کے بارے میں گفتگو کے وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عمر کی روایت بھی اسی قبیل کی ہے۔ ان روایتوں کی ایک اور توجیہ بھی ہے جس کا ذکر بعد میں کروں گا۔

تیسرا نقطۂ نظر ''انسائیکلو پیڈیا بریطانیکا'' مطبوعہ ۱۹۷۷ء (۴۸۷/۱۲) میں بیان کیا گیا ہے کہ اسرائیلیوں پر ظلم ڈھانے والا فرعون جس کا ذکر بائیبل کتاب خروج (۱:۱۱، ۲:۲۳) میں ہے وہ سیتی اول (SettiI) (۱۳۱۸۔۱۳۰۴ قبل از مسیح) تھا اور خروج کے وقت ڈوب مرنے والا رمسیس (۱۳۰۴۔۱۲۳۷ قبل از مسیح) تھا۔ یہ نقطۂ نظر درست معلوم ہوتا ہے، کیونکہ اس سے ''بائیبل ،قرآن اور سائنس'' کے مصنف کے وہ اعتراضات جو اس نے کتاب مقدس کی روایات کی بنا پر کیے ہیں، دور ہو جاتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مدین میں قیام کے دوران میں جس بادشاہ مصر کی موت ہوئی، وہ رمسیس ثانی کا باپ سیتی اول ہو اور مدین سے واپسی پر جس بادشاہ کو انھوں نے اسی برس کی عمر میں بنو اسرائیل کی نجات کے بارے میں مخاطب کیا، وہ رمسیس ثانی ہو، کیونکہ عام مآخذ خروج کی تاریخ تیرہویں صدی قبل از مسیح کے نصف یا آخر میں لکھتے ہیں اور یہ تاریخ رمسیس ثانی کے عہد حکومت میں شامل ہے۔

چوتھا نقطۂ نظر یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے زمانے کا فرعون ایک ہی ہے اور اس کا نام رمسیس ثانی ہے۔

رمسیس ثانی کے دور کی چار مختلف تقویمات کا پتا چلتا ہے:

۱۔ Drionon کی کرونولوجی، ۱۳۰۱۔۱۲۳۴ قبل از مسیح۔

۲۔ Rowton کی کرونولوجی، ۱۲۹۰۔۱۲۲۴ قبل از مسیح۔

۳۔ انسائیکلو پیڈیا بریطانیکا ۱۹۷۷ء کی کرونولوجی، ۱۳۰۴۔۱۲۳۷ قبل از مسیح۔

۴۔ وہ لوح جو مصری عجائب گھر میں ممی کے سرہانے نصب ہے، ۱۲۷۹-۱۲۱۳ قبل از مسیح۔

یہ سب تقویمیں غیر یقینی ہیں، کیونکہ تاریخ سے ماقبل دور میں تاریخ کا تعین ممکن نہ تھا۔ ان میں سے Rowton کی کرونولوجی، یعنی ۱۲۹۰ سے ۱۲۲۴ قبل از مسیح مستند ترین معلوم ہوتی ہے۔

جناب عبدالستار غوری صاحب ''المورد'' سے وابستہ ہیں۔ اسرائیلیات، مصریات، یہودیت اور عیسائیت پر ان کی نظر بڑی گہری ہے۔ ان کے ذاتی کتب خانے میں اس موضوع پر کتابوں کا اتنا بڑا ذخیرہ ہے کہ شاید لاہور کی کسی بھی لائبریری میں اس موضوع پر اتنی کتابیں نہ ہوں۔ انھوں نے انگریزی جریدے رینی ساں (Renaissance) کے دسمبر ۲۰۰۳ کے شمارہ میں صفحہ ۳۱ سے لے کر ۴۲ تک ''A Clear Cut Prophecy'' کے عنوان سے ایک محققانہ مضمون لکھا ہے، جس سے یہ گتھی کسی حد تک سلجھ گئی ہے۔ اس مضمون میں وہ ''Oxford Bible Atlas'' مطبوعہ ۱۹۸۴ء صفحہ ۱۶ مصنفہ Herbert,G.May کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

''امکان غالب ہے کہ اسرائیلیوں کی تعذیب اور مصر سے ان کا خروج رمسیس ثانی (۱۲۹۰۔۱۲۲۴) کے عہد میں ہوا۔''

Bernard W, Anderson نے اپنی کتاب ''Understanding the OT'' مطبوعہ ۱۹۷۵ء صفحہ ۶۰۲ اور John Bright نے اپنی کتاب ''A History of Israel'' مطبوعہ ۱۹۶۷ء صفحہ ۴۶۵ پر رمسیس ثانی کے عہد حکومت کی تاریخ ۱۲۹۰۔۱۲۲۴ قبل از مسیح لکھی ہے۔

''New Bible Atlas'' نے آثار قدیمہ کی تحقیق کی روشنی میں نتیجہ نکالا ہے کہ خروج کا واقعہ ۱۲۳۰/۱۲۲۰ قبل از مسیح میں ہوا۔ K.A.Kitchen اور T.C.Mitchill نے ''New Bible Dictionary'' مطبوعہ ۱۹۸۲ء صفحہ ۱۹۵ پر ایک مقالہ لکھا ہے جس کا عنوان ہے: ''Chronology of the OT''۔ اس مقالہ میں انھوں نے رمسیس ثانی کا عہد حکومت ۱۲۹۰۔۱۲۲۴ قبل از مسیح بتایا ہے۔

ان حوالوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ رمسیس ثانی کی کرونولوجی میں ۱۲۹۰۔۱۲۲۴ قبل از مسیح کو علما نے مستند ترین قرار دیا ہے۔ Father de vaux نے ''The Ancient History of Israel'' میں بڑے شد و مد سے رمسیس ثانی کو یہی ڈوب مرنے والا فرعون قرار دیا ہے۔

عبدالستار غوری صاحب اپنے محققانہ مقالہ کے آخر میں صفحہ ۴۱ پر لکھتے ہیں:

''لٰہذا خروج ۱۲۲۴ قبل از مسیح میں ہوا اور یہی وہ سن ہے جب رمسیس ثانی اسرائیلیوں کا تعاقب کرتے ہوئے ڈوب مرا۔''

یہ اقرار کرنے میں مجھے کوئی باک نہیں کہ اگر محترم عبدالستار غوری اور ان کی رہنمائی نہ ہوتی، اگر ان کا کمرا اور ان کی کتابیں نہ ہوتیں تو میں واقعۂ خروج اور ڈوب کر مرنے والے فرعون کی حتمی تاریخ تک نہ پہنچ پاتا۔ اسرائیلیات اور مصریات کے تمام اہم مآخذ میں اس موضوع کو تشنہ چھوڑا گیا ہے۔

رمسیس کی ممی

شاہانہ ممیوں کے کمرے میں میں نے دو چکر لگائے۔ ممیائی ہوئی لاشیں لنن میں لپٹی ہوئی تھیں اور اکثر کے چہرے ڈھانپے ہوئے نہیں تھے، مگر شہزادی میرٹ امون (Merit Amun) کا چہرہ ڈھکا ہوا تھا۔ رمسیس ثانی کی ممی کا چہرہ صحیح سلامت تھا۔ ۱۸۸۱ء میں طیبہ کی وادی الملوک میں الدیرالبحری جگہ کے قریب ایک گہرے مقبرے سے ۴۰ ممیاں دریافت ہوئیں، ان میں رمسیس کی ممی تھی۔ اس وقت سے یہ ممی قاہرہ کے عجائب گہر میں پڑی ہوئی ہے۔ پہلی مرتبہ ۱۹۷۴ء میں اسے فنگس (Fungus) کے علاج کے لیے پیرس بھیجا گیا۔ پھر ۱۹۷۷ء میں اسے دوبارہ پیرس روانہ کیا گیا۔ قدیم مصری نسبتاً کوتاہ قامت تھے، اوسطاً ان کا قد ۵ فٹ ۱۳نچ تھا، مگر رمسیس کا قد چھ فٹ تھا۔ یہ ایک بوڑھے آدمی کی ممی ہے جس کا چہرہ پچکا ہوا، ناک نمایاں اور خم دار اور جبڑے بڑے ہیں۔ ایکسرے سے پتا چلا کہ اس کے ایک کاندھے پر زخم کا نشان تھا جو دوران جنگ لگا اور پاؤں کے ایک انگوٹھے کی ہڈی ٹوٹ کر جڑ گئی تھی۔ اس کے بال قدرتی طور پر سرخ تھے سرہانے تختی پر لکھا ہے کہ وہ وجع المفاصل اور ڈاڑھوں میں ریشہ (Abscess) جیسے بڑھاپے کے امراض میں مبتلا ہو گیا تھا۔ موت کے وقت اس کی عمر قریباً ۱۰۰ تھی۔

بہت سے مفسرین مثلاً مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا محمد علی لاہوری کی بھی یہی رائے ہے کہ ڈوب کر مرنے والا فرعون رمسیس ثانی تھا۔ بہرحال ڈوبنے والا فرعون تحتمس ثالث ہو یا رمسیس ثانی یا منفتاح، ان تینوں کی ممیاں قاہرہ کے عجائب خانہ میں موجود ہیں اور قرآنی آیت کی شہادت دے رہی ہیں کہ:

فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰيَةً وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ عَنْ اٰيٰتِنَا لَغٰفِلُوْنَ. (یونس ۱۰:۹۲)

''سو آج ہم تیرے بدن کو بچائے دیتے ہیں تاکہ تو اپنے بعد کے آنے والوں کے لیے نشانی بن جائے اور درحقیقت بہت سے لوگ ہماری نشانیوں سے غافل ہیں۔''

اہرام مصر

عجائب گھر دکھانے کے بعد گائیڈ ہمیں جیزہ کے اہرام دکھانے لے گیا۔ یہ جیزہ قاہرہ کے مضافات میں ایک مستقل بستی ہے جس کی علیحدہ میونسپل کمیٹی ہے، یہ قاہرہ کے میدان ازبکیہ سے تقریباً ۱۲ کلومیٹر اور دریاے نیل سے ساڑھے آٹھ کلومیٹر کے فاصلہ پر ہے۔ یہاں پر تین بڑے اہرام ہیں۔ اور تینوں کا تعلق فراعنہ کے چوتھے خاندان

سے ہے۔ پہلا اور سب سے بڑا ہرم بادشاہ خوفو (Cheops) کا ہے، دوسرا اس کے بھائی (گائیڈ نے غلطی سے اس کا بیٹا کہا) خفرع (Chephren) کا اور تیسرا خفرع کے بیٹے منقرع (Mikerines) کا ہے۔ ان اہرام کا آنکھوں دیکھا حال بیان کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہرم کی تعریف اور اس کے اوصاف بیان کر دیے جائیں۔

ہرم کی جمع اہرام ہے۔ علم ہندسہ کی رو سے ہرم (Pyramid) مخروطی شکل کی عمارت کو کہتے ہیں جس کی کرسی مثلث یا عموماً مربع یا کثیر الاضلاع ہوتی ہے۔ اس کی چار دیواریں ہوتی ہیں، ہر دیوار مثلث شکل کی ہوتی ہے جس کا سرا اوپر کو نکلا ہوتا ہے۔ چاروں دیواروں کے سرا اوپر جا کر مل کر ایک ہی سر دکھائی دینے لگتے ہیں اور اسے ہرم کی چوٹی کہا جاتا ہے۔

اہرام کی غرض و غایت کیا ہے؟ اہرام بنیادی طور پر قبریں ہیں۔ یہ اس جنائزی کمپلیکس کا حصہ ہوتے ہیں جو فراعنہ کی حیات بعد الممات کے لیے بنائے جاتے تھے۔ فراعنہ کو چونکہ معبود کا درجہ حاصل تھا، اس لیے ان کی ممی اور اس کے ساتھ دفن خزانے کی حفاظت کا پورا سامان کیا جاتا تھا۔ حفاظت کے لیے تابوت کے گرد بڑے بڑے لکڑی کے تبرک خانوں میں معبودوں کے مجسمے رکھے جاتے تھے۔ وہاں طلسمی عبارتیں کندہ ہوتی تھیں جو موت کے بعد کی زندگی میں فراعنہ کی مددگار ہوتی تھیں۔ مشہور تھا کہ جو ان کو ہاتھ لگائے گا، وہ زندہ نہیں بچے گا۔ چنانچہ 'Lord Carnaron' جب توت انخ امون کی ممی کی دریافت کے چار ماہ بعد ہی مر گیا تو مشہور ہو گیا کہ اس پر ممی کی لعنت نازل ہوئی ہے۔ اس واقعہ کے کم و بیش ایک صدی گزرنے کے بعد بھی ہمارے یہاں لوگ فراعنہ کے پیدا کیے ہوئے اسی قسم کے اوہام میں مبتلا ہیں۔

ہرم کی تعمیر کا کام فرعون کی زندگی میں ہوتا رہتا تھا۔ لاکھوں مزدور بھاری بھرکم پتھر ڈھوتے رہتے۔ ہر تین ماہ کے بعد تازہ دم مزدور لائے جاتے۔ چٹان کو کھود کر تابوت کا کمرا بنایا جاتا۔ اس کے ارد گرد کئی دالان بنائے جاتے۔ چوروں اور لٹیروں کو دھوکا دینے کے لیے اس کمرے کے علاوہ بھی کمرے بنائے جاتے۔ ہر کمرے پر گمان گزرتا کہ یہ تابوت کا کمرا ہے۔ ہرم کے نیچے داخل ہونے کا دروازہ اس طرح بنایا جاتا کہ ممی کے حقیقی کمرے کا پتا نہ چلے۔ گرینائٹ کے دروازے اور کئی چھوٹی چھوٹی گزرگاہیں بنا دی جاتیں تاکہ ان لٹیروں کو روکا جا سکے جو فرعون کے ساتھ دفن ہونے والے خزانے کی تلاش میں داخل ہوں۔ بادشاہ کی وفات کے فوراً بعد اس کی حنوط شدہ لاش کمرے میں رکھ دی جاتی۔ پھر ارد گرد کے دالانوں کو پتھروں سے پاٹ دیا جاتا۔ آخر میں پورے ہرم کو نرم ریت سے ڈھانپ دیا جاتا جس سے داخل ہونے والا دروازہ بھی چھپ جاتا۔ ابتدا میں ہرم کو زینہ بہ زینہ بنایا جاتا پھر چٹانوں کو تراش خراش کر

برابر کر دیا جاتا۔ چنانچہ سقارہ کا ہرم زینہ بہ زینہ ہی بنا ہوا ہے جو دنیا کی قدیم ترین پتھر کی بنی ہوئی عمارت ہے۔

اہرام لق ودق صحرا میں واقع ہیں، جہاں کوئی پتھر اور کوئی عمارت نظر نہیں آتی۔ لگتا ہے کہ انھیں کسی انسان نے نہیں بنایا، بلکہ کسی معبود نے اسے ریگ زار کے وسط میں لا کھڑا کیا ہے۔ چھ سات ہزار قبل از مسیح سے یہ پتھر اپنی اصلی شکل میں موجود ہیں اور رہتی دنیا تک یوں ہی رہیں گے، اسی لیے ان کا شمار دنیا کے سات عجائبات میں ہوتا ہے۔

طرز تعمیر میں اس قدر احتیاط کے باوجود ۱۰۰۰ قبل از مسیح تک اہرام کی ممیوں سمیت سب قیمتی چیزیں چوری ہو چکی تھیں۔ اس کا آغاز فارسی حملہ آور قمبیز (Cambyse) نے کیا جس نے خوفو کے ہرم کے خزانے کو لوٹ کر خارجی دروازہ بند کر دیا تاکہ آنے والی نسلوں کو اس کی وحشیانہ حرکت کا پتا نہ چلے۔

یوں تو مصر میں چھوٹے چھوٹے بہت سے ہرم ہیں، مثلاً ہرم ابو رواش، ابوصیر الاول، ابوصیر الثانی، سقارہ اور مصطبۃ الفیوم (فیوم کا چبوترہ)، مگر تین بڑے ہرم جیزہ میں واقع ہیں جن کو دیکھنے کا مجھے موقع ملا۔

سب سے بڑا اہرم، ہرم خوفو (Cheops)

ہمارے قبطی گائیڈ نے ہمارے لیے ٹکٹ خریدا اور بڑے ہرم کے سامنے کھڑے ہو کر عربی میں ہرم اور صاحب ہرم کی مختصر تاریخ بتانے لگا۔ آج سے تقریباً پانچ ہزار برس پہلے خوفو نے مصر پر پچاس برس تک حکومت کی۔ وہ فراعنہ کے چوتھے خاندان کی ایک ممتاز شخصیت تھا۔ اور اس نے اپنی قبر کے لیے مصر کا سب سے بڑا اہرم تعمیر کیا۔ ایک لاکھ مزدور مصر میں ''طرّہ'' اور ''تمرہ'' کی کھدانوں سے پتھر نکال کر لاتے تھے۔

اس میں ۲۰۲ ملین پتھر استعمال ہوئے۔ پتھر کا وزن اڑھائی ٹن سے لے کر ۱۵ ٹن تھا۔ اتنے عرصے سے یہ پتھر اصل شکل میں موجود ہیں۔ اس حرم کی تعمیر میں بیس برس کا عرصہ لگا۔ اس کی بلندی ۱۴۸ میٹر (۴۸۰ فٹ) ہے۔ اسے دیکھ کر انسان پر وحشت طاری ہو جاتی ہے۔ یہ انسانوں کے ہاتھ کا بنا ہوا نہیں لگتا، ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے کسی دیوتا کے ہاتھ نے اسے ریگ زار کے درمیان کھڑا کر دیا ہو۔

اندر داخل ہونے کا دروازہ زمین سے ۱۸ میٹر اونچا ہے۔ میں سیڑھیوں کے ذریعہ سے دروازہ تک پہنچا۔ اندر جانے کے لیے غیر ملکیوں کو ۱۰۰ پونڈ مصری (تقریباً ۱۲۰۰ روپے) کی ٹکٹ خریدنا پڑتی ہے۔

مستطیل شکل کی چھتی ہوئی گزرگاہ سے گزر کر تابوت والے کمرے تک پہنچا جو بالکل خالی تھا، ان تینوں اہرام کی ممیاں اور خزانے چوری ہو چکے ہیں، عجائب گھر میں صرف ان کے مجسمے موجود ہیں۔

عربی مورخین لکھتے ہیں کہ ۸۲۰ء تک ہر ہرم موجود تھا اور سنگ خارا سے ڈھکا ہوا تھا، خلیفہ مامون کے حکم سے اس کے دروازے کو دریافت کرنے کی کوشش کی گئی۔ وہ کھودتے کھودتے گرانیٹ کے چمک دار کمرے تک پہنچے، مگر وہ بالکل خالی تھا۔ یقینی بات تھی کہ خلیفہ کے کارندوں کے دخول سے پہلے ہرم لوٹا جا چکا تھا۔ چند سکوں اور ایک آدھ مجسمے کے علاوہ وہاں کچھ نہ ملا۔ عہد اسلامی سے پہلے رومانیوں اور یونانیوں کے عہد حکومت میں ہمیں کسی لوٹ مار کا سراغ نہیں ملتا۔ گمان غالب ہے کہ فارسی حملہ آور قمبیز (Cambyse) نے ۵۲۷ قبل از مسیح میں ایتھیوپیا (Ethiopia) کے ناکام حملہ کے بعد ممفیس کے معابد کو برباد کیا اور قدیم فراعنہ کی قبروں کو لوٹ کر خارجی دروازہ کو اس طرح ڈھانپ دیا کہ آنے والی نسلوں کو اس کی اس وحشیانہ حرکت کا پتا نہ چلے۔ بہرکیف تابوت کے خالی کمرے کو دیکھ کر لوٹ آیا۔ بڑے ہرم کے مغرب میں تین چھوٹے ہرم ہیں جن میں سے ایک اس کی بیٹی کا ہے۔

ہرم خفرع (Chephren)

خوفو کی موت کے بعد اس کا بھائی (نہ کہ اس کا بیٹا جیسا کہ غلط طور پر مشہور ہے) تخت نشین ہوا۔ اس نے چھپن برس حکومت کی۔ اس نے بھی خوفو کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اپنی قبر کے لیے ہرم بنایا۔ اس ہرم کی اونچائی ۱۳۷ میٹر ہے۔ اس کا اوپر والا حصہ ابھی تک نرم ریت سے اسی طرح ڈھکا ہوا ہے جیسا اصل میں تھا۔ اس کے دو دروازے ہیں ایک کی بلندی اتنی ہی ہے جتنی خوفو کے ہرم کے دروازے کی اور دوسرا دروازہ کرسی کی سطح پر ہے۔ بلزونی (Belzoni) نامی شخص نے اسے ۱۸۱۸ء میں دریافت کیا۔ تابوت والے کمرے کی لمبائی ۱۵ میٹر، چوڑائی ۵ میٹر اور اونچائی ۷ میٹر ہے۔ یہ کمرا بلزونی کمرے کے نام سے مشہور ہے۔ بلزونی نے دیکھا کہ تابوت میں ممی کے بجائے بھینس کی ہڈیاں موجود تھیں۔ ہرم کے سامنے مغرب کی طرف کھنڈرات ہیں، ہوسکتا ہے کہ وہ خفرع کی قبر کے سامنے عبادت گاہ ہو، کیونکہ خفرع کو الٰہ سمجھ کر اس کی پوجا کی جاتی تھی۔ مصریوں کا عقیدہ تھا کہ ہر فرعون اپنی زندگی میں کسی دیوتا کا اوتار ہوتا ہے۔

ہرم منقرع (Mikerines)

خفرع کے بعد اس کا بیٹا منقرع تخت نشین ہوا۔ اس نے اپنے باپ کے برعکس ملک میں دینی فضا قائم کی، عبادت گاہوں کو کھول دیا اور لوگوں کو دینی تہوار منانے کی اجازت دے دی۔ ملک میں عدل و انصاف کا دور دورہ ہو گیا۔ لوگ اسے پسند کرتے تھے۔ اس ہرم کی بلندی ۶۶ میٹر ہے۔ یہ ہرم پہلے دو ہرموں کی نسبت زیادہ محفوظ ہے۔

اس کے اندرونی حصے میں ابھی تک گرینائٹ کا غلاف موجود ہے۔ ۱۱۹۶ء میں سلطان عزیز عثمان بن صلاح الدین کے کارندوں نے خفرع کے ہرم پر حملہ کیا تو بعض لوگوں نے سلطان کو مشورہ دیا کہ سب اہرام گرا دیے جائیں (جیسا کہ طالبان نے بامیان میں گوتم بدھ کے قدیم مجسموں کو گرانے کا حکم دیا) تو سلطان نے فوراً یہ حکم صادر کر دیا اور مزدور تیسرے ہرم، یعنی منقرع کے ہرم کو گرانے کے لیے پہنچے۔ پورے آٹھ ماہ تک ہرم کے ٹیلے پر رہے اور پورے دن میں ایک یا دو پتھروں سے زیادہ نہ توڑ سکے۔ جب ان کی ہمت جواب دے گئی۔ اور اس پراجیکٹ کے لیے مخصوص پیسا ختم ہو گیا تو یہ مجنونانہ حرکت بھی ختم ہو گئی۔ ۱۸۳۷ء میں کرنل وائز (Wyze) کی زیر قیادت اس ہرم میں داخل ہونے کا دروازہ دریافت ہوا۔ یہ دروازہ سطح زمین سے ساڑھے چار میٹر اونچا تھا۔ ۳۵۰ میٹر لمبی گزرگاہ سے گزر کر ایک ۱۰ میٹر لمبے اور ۴ میٹر چوڑے کمرے میں پہنچا گیا۔ اس میں لکڑی کے تابوت کے باقی ماندہ حصے ملے جس پر لکھا ہوا تھا: ''اے بادشاہ اوزیرس (Osiris) یعنی منقرع، تو ابدالآباد تک زندہ رہے! تیری ولادت آسمان سے ہوئی ہے، تیری ماں نے تیرے دشمنوں کو تباہ و برباد کر کے تجھے معبود بنایا ہے۔'' اوزیرس اس علاقہ کو بھی کہا جاتا ہے جہاں بہت سے قبرستان ہوں اور اسے زیر زمین بوسیدہ دنیا کا دیوتا بھی تصور کیا جاتا ہے۔ مصری اپنے بادشاہ کو دیوتا کا اوتار سمجھتے تھے۔ اس کمرے کے نیچے دو اور کمرے تھے۔ ایک میں خالی تابوت تھا جس پر کچھ لکھا ہوا نہ تھا، اسے انگلینڈ بھیج دیا گیا اور دوسرے کی دیواروں میں تراشے ہوئے گڑھے تھے۔ ہوسکتا ہے کہ ان میں حنوط شدہ لاشیں رکھی گئی ہوں۔ ہرم کے مشرقی جانب کھنڈرات ہیں جو منقرع کی خاص عبادت گاہ معلوم ہوتی ہے۔

اہرام کے دامن میں بازار لگے ہوئے تھے جہاں یادگار چیزیں مثلاً فراعنہ کے مجسمے، اہرام کی تصویریں اور دیگر تحفے تحائف بیچے جا رہے تھے۔ سیاحوں کا ہجوم تھا، خوب ریل پیل تھی۔ ٹورزم اور سیاحت سے مصر خوب کماتا ہے۔

اہرام دکھانے کے بعد گائیڈ ہمیں ابوالہول (Sphinx) دکھانے لے گیا۔

ابوالہول

سفنکس یونانی دیو مالا کے مطابق ایک خطرناک اور تباہ کن نسوانی مخلوق ہے جو ان مردوں کو تباہ و برباد کر دیتی ہے جو اس کی پہیلی نہ بوجھ سکیں، مگر مصری روایات کے مطابق ''سفنکس'' کا جسم شیر کا اور سر انسانی حکمرانوں کا ہوتا ہے۔ شیر کو سورج دیوتا کی تخلیق سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ حکمران کو بھی سورج دیوتا (Re) کا بیٹا گردانا جاتا ہے۔ شیر کی جسمانی طاقت حکمران کی جسمانی طاقت کی نمائندگی کرتی ہے۔ اس سے قوت اور عقل کے ساتھ ساتھ چلنے کا اشارہ بھی ہے۔ اس عمارت کو ۴۵۰۰ قبل از مسیح میں فرعون خفرع کے لیے تعمیر کیا گیا تا کہ اس کے ہرم کو جانے والے راستے کی

حفاظت کرے۔ چنانچہ یہ خفرع کے ہرم کے مشرق کی طرف ۵۰۰ میٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ایک روایت کے مطابق خفرع سے پہلے منف میں بسنے والے تیسرے خاندان نے اسے بنایا۔اس مجسمہ کی لمبائی ۲۰ میٹر چوڑائی ۴ میٹر اوراونچائی ۳۹ میٹر ہے۔سفنکس کوعرب ابوالہول یا ابوالخوف والفزع کے نام سے پکارتے ہیں،یعنی ہول ناک اور ڈراؤنا۔مرورزمانہ کے ساتھ ریت اس مجسمے کے گرد جمع ہوگئی تھی۔تحتمس چہارم (Tuthomosis iv) نے اس مجسمے کے گرد سے ریت کو ہٹایا۔ابوالہول کے پیچھے ۴ میٹر اونچا گرینائٹ کا بنا ہوا نوکیلا برج ہے جس پر اٹھارھویں خاندان کے فرعون تحتمس چہارم کی تصویر ہے جو ابوالہول کو دیوتا سمجھتے ہوئے ایک طرف دھونی دے رہا ہے اور دوسری طرف سے شراب کا جام پیش کر رہا ہے۔

عبدالرحمٰن ابن خلدون لکھتا ہے کہ ابوالہول کوایک مقدس مورتی سمجھا جاتا تھا جو کھیتی باڑی کوصحرا کے ریتلے طوفانوں سے بچاتی تھی۔اس کے بعض حصوں کو دسویں صدی میں سلطان برقوق کے عہد حکومت میں کسی متعصب مذہبی رہنما کے حکم سے توڑ دیا گیا۔وہ مزید لکھتا ہے کہ روایت کے مطابق جن دو آدمیوں نے اس دیوہیکل مجسمے کی ناک لوہے کے گرز سے توڑی وہ دونوں بڑے بڑے پتھروں کے بلاک پر گرے اور مر گئے۔اسی وقت صحرا کی گرم تیز ہوا چلی تو لوگوں کو یقین ہو گیا کہ مورتی نے انتقام لے لیا ہے اور کوئی بھی اس کے غصے کے خوف سے اس کو چھوتا تک نہیں تھا۔ مقریزی اپنی کتاب ''خطط مصر'' میں اس مجسمے کو بڑی پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور کہتا ہے کہ ایک مجنون مسلمان شیخ تھا جس کا نام محمد اور لقب صائم الدھر (ہمیشہ روزہ دار) تھا۔اس نے ازراہ حماقت اللہ کے قرب کی خاطر لوہے کے گرز سے مجسمے پر کئی ضربیں لگائیں تو مجسمے کے کچھ اجزا ٹوٹ گئے جن کی مرمت کبھی نہ ہوسکی۔آج تک ان چوٹوں کے نشانات مجسمے پر باقی ہیں،اس سے یہ پتا چلتا ہے کہ بارہویں صدی عیسوی تک یہ مجسمہ صحیح سلامت تھا۔

اہرام کا محافظ پتھر کا بنا ہوا یہ مجسمہ ہے جو آدھا مجسمہ ہے اور آدھا پہاڑ جس کا کچھ حصہ ٹوٹ چکا ہے۔اپنے بڑے کانوں کے ساتھ سنتا بھی ہے اور گول گول آنکھوں کے ساتھ دیکھتا بھی ہے۔ان کانوں سے وہ ماضی کی آواز سنتا ہے اور آنکھوں سے رازدارانہ انداز میں مستقبل کو دیکھتا ہے۔ابوالہول ہیبت،سکون اور جمود کی علامت ہے۔امیر الشعرا احمد شوقی نے ایک طویل قصیدہ میں ابوالہول کو مخاطب کرتے ہوئے موت وحیات کے فلسفہ کو بڑے سادہ الفاظ میں بیان کیا ہے۔وہ کہتے ہیں: اے ابوالہول بے مقصد لمبی زندگی سے بیزاری کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا اور:

ان الحیاۃ تفل الحدید

اذ لبستہ و تبلی الحجر

''اگر زندگی کو لوہے کا لباس پہنا دیا جائے تو وہ بھی زنگ خوردہ ہو کر ٹوٹ پھوٹ جائے گا اور اگر اسے پتھر کا لباس پہنا دیا جائے تو وہ بھی رگڑ رگڑ کر گھس جائے گا (کیونکہ زندگی تغیر پذیر ہے)۔''

ہر دم رواں پیہم دواں ہے۔ حرکت زندگی کا خاصہ ہے اور سکوت موت کا۔ زندگی کی قوت حرکت اور تغیر میں مضمر ہے، جبکہ موت نام ہے جمود اور سکوت کا۔ ابوالہول کے بارے میں ان کا یہ شعر بڑا معنی خیز ہے:

تحرك ابا الهول هذا الزمان

تحرك مافيه حتى الحجر

''اے ابوالہول، اس زمانے میں تو پتھر بھی حرکت کر رہے ہیں تو کیوں حرکت نہیں کرتا۔''

اس شعر میں انھوں نے ابوالہول کو علامت کے طور پر استعمال کر کے ان ظلمت پسندوں (Obscurantists) کو مخاطب کیا ہے جو طرز کہن پر اڑتے اور آئین نو سے ڈرتے ہیں۔ زندگی آگے بڑھتی ہے، پیچھے نہیں ہٹتی۔ یہی قانون فطرت ہے اور یہی سنت الٰہیہ:

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ. (الرعد ۱۳: ۱۱)

''اللہ تعالیٰ کسی قوم کی حالت میں اس وقت تک تغیر نہیں لاتا جب تک وہ خود اپنی حالت میں تغیر نہیں لاتی۔''

۱۰ دسمبر ۲۰۰۶ کو ابوالہول کا مجسمہ دیکھنے کے بعد گائیڈ ہمیں بردی (Papyrus) کا کارخانہ دکھانے لے گیا جو جیزہ ہی میں واقع ہے۔ بردی کا پودا سرکنڈے سے ملتا جلتا ہے، یہ دریاے نیل کے کنارے پر اگتا ہے۔ اس کی لمبائی ۱۳ فٹ کے قریب ہوتی ہے۔ اس کا تنا لمبا، نرم اور گودے دار ہوتا ہے۔ اس سے ٹوکریاں اور چٹائیاں بنائی جاتی ہیں۔ قدیم مصری اس سے کاغذ بناتے تھے۔ تنے کو چار پانچ ٹکڑوں میں کاٹ کر آپس میں جوڑ لیا جاتا ہے پھر ان ٹکڑوں کو ایک شکنجے میں ڈال کر پریس کیا جاتا ہے جس سے پانی نکل جاتا ہے۔ پھر ان جڑے ہوئے ٹکڑوں کو خشک ہونے دیا جاتا ہے، یہاں تک کہ یہ سب ٹکڑے پچک کر آف وائٹ (Off White) رنگ کے موٹے کھردرے کاغذ کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ ان پر فراعنہ مصر کی تصویریں بنا کر یا اہرام کی منظر کشی کر کے یا قرآن حکیم کی آیات لکھ کر تزیین و آرایش کے لیے ''بردیات'' کے نام سے مہنگے داموں بیچا جاتا ہے۔ اس کارخانہ میں بہت بڑا شوروم تھا جس میں ہر سائز کی بردیات فروخت ہوتی تھیں۔ ان کی قیمت میں گائیڈ کی کمیشن بھی شامل ہوتی ہے۔

بہرکیف سیاحت کا پہلا دن خوب مصروف گزرا۔ شام کے وقت تھکے ہارے ہم ایجنسی کی گاڑی سے ہوٹل لوٹ

آئے۔ ہوٹل کے ڈائننگ ہال کے برابر میں بار روم (میکدہ) تھا جہاں سیاحوں کو مےنوشی کی کھلے عام اجازت تھی۔

سیاحت کا پہلا دن یوں گزر گیا اور بقول تلوک چند محروم عمر راہ وفا کی منزل اوّل ہوئی تمام۔

اگلے روز، یعنی ۱۱ دسمبر ۲۰۰۶ کو جزیرہ ایجنسی کا نمائندہ قبطی گائیڈ سمیت صبح دس بجے ہوٹل آیا۔ اور ہمیں سیاحت کے لیے لے گیا۔ اس روز ہمارے شیڈول میں قلعہ صلاح الدین، مسجد محمد علی پاشا، مسجد سلیمان الخادم، مسجد احمد بن طولون اور مسجد عمرو بن العاص کی زیارت تھی۔

ساتویں صدی عیسوی میں مصر میں فرعونی ثقافت کی جگہ اسلامی ثقافت نے لے لی۔ مصر کی مساجد، مقابر اور قلعے عربی اور ترکی کی اسلامی ثقافت کا مظہر ہیں۔ فرعونی ثقافت عبارت ہے جان داروں کے بھاری بھرکم، ہیبت ناک مجسموں اور پراسرار معابد سے جبکہ اسلامی ثقافت کو جان داروں کی شکلوں کے بجائے پھولوں، پتیوں اور ہندسی شکلوں کے بڑے دقیق نمونوں میں پیش کیا جاتا ہے۔ اور انھی سے گل کاری (Arabesque) کی جاتی ہے یا پھر روغنی مٹی، شیشوں اور پتھروں کو بچھا کر پچی کاری (Mosaic) کی جاتی ہے، جس طرح دین اسلام روز روشن کی طرح عیاں ہے، اس میں کوئی چیز پراسرار نہیں، اسی طرح اسلامی ثقافت واضح اور روشن ہے۔ اس میں لطافت اور نزاکت ہے، فرعونی تہذیب جیسا بھاری پن اور راز داری نہیں۔ ہاں، بازنطینی، فارسی اور ہندی طرز تعمیر اسلامی طرز تعمیر پر اثر انداز ہوا ہے۔

قلعہ صلاح الدین

یوں تو قلعہ کی مختصر تاریخ قلعہ کے بڑے دروازے پر بھی عربی میں رقم تھی، مگر ہمارے گائیڈ نے حسب عادت قلعہ میں داخل ہونے سے پہلے اس کی مختصر تاریخ بیان کی۔

یہ قلعہ جبل مقطم کے ایک بلند و بالا اور گول قطعہ زمین پر تعمیر کیا گیا ہے۔ جس کے جنوب مشرق سے پورا قاہرہ نظر آتا ہے۔ رمیلہ کے میدان سے قلعہ میں داخل ہونے کے دو مختلف دروازے ہیں: ایک نیا دروازہ جہاں پارکنگ کے لیے وسیع جگہ ہے اور دوسرا باب العزب جو زمانۂ وسطیٰ کے دو برجوں کے درمیان ایک تنگ گزرگاہ پر کھلتا ہے جسے چٹان کو تراش کر بنایا گیا ہے۔ یہ وہی گزرگاہ ہے جس میں یکم مارچ ۱۸۱۱ کو محمد علی پاشا نے سینکڑوں ممالیک کو تہ تیغ کیا۔ عید کے موقع پر ان کو کھانے کے لیے بلایا گیا۔ جب وہ اس گزرگاہ سے گزرنے لگے تو انھیں دھوکا سے ذبح کر ڈالا گیا۔

بارہویں صدی عیسوی میں امیر بہاءالدین، جس کا لقب قرقوش (کالی چڑیا) تھا، نے سلطان صلاح الدین کے

حکم سے قلعہ بنایا۔ اس جگہ طولونیوں کے زمانہ کا قدیم قلعہ تھا۔ قلعہ کی تعمیر کے بعد فصیل کھینچتے وقت اس بات کا خیال رکھا گیا کہ دیواریں نہ صرف دارالحکومت، بلکہ فسطاط کی بھی حفاظت کریں۔ قلعہ کی تعمیر کے لیے مواد جیزہ کے چھوٹے اہرامات اور منف کے آثار سے حاصل کیا گیا۔ اخراجات کو پورا کرنے کے لیے ٹیکسوں میں اضافہ کیا گیا تو لوگوں نے امیر بہاؤالدین کے خلاف مظاہرے شروع کر دیے، وہ نوبی (Nubian) تھا، اس لیے اسے قرقوش (کالی چڑیا) کا لقب دے دیا۔

قلعہ میں سب سے نمایاں جگہ صلاح الدین کا محل تھا۔ جو دکّۃ یوسف (یوسف کا چبوترہ) کہلاتا تھا۔ وہ گل کاری اور پچی کاری کا اعلیٰ نمونہ تھا جسے ۱۸۲۹ء میں گرا دیا گیا۔ اس جگہ اور گری ہوئی جامع طولون کے قریب محمد علی پاشا نے اپنا محل اور مسجد تعمیر کی۔ صلاح الدین کا قلعہ تین اجزا میں منقسم ہے: ایک کو العزب، دوسرے کو الانکشاریہ اور تیسرے کو القلعہ کہا جاتا ہے جو بلند ترین ہے۔ ہر جز کے گرد فصیل اور نوک دار برج بنے ہوئے ہیں۔ قلعہ کا مضبوط ترین حصہ وہ ہے، جہاں سے شہر نظر آتا ہے جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مصر کے سلطان، پاشا اور امرا خارجی حملوں سے حفاظت کے بجائے انقلاب اور خانہ جنگیوں کے خوف سے اس قلعہ کو پناہ گاہ کے طور پر استعمال کیا کرتے تھے۔ اس وقت پرانی دیواروں کے سوا قلعہ میں کوئی قدیم چیز موجود نہیں۔ قلعہ کے اندر ایک جنگی عجائب گھر ہے جس میں اس زمانہ کے ہتھیاروں کو محفوظ کیا گیا ہے۔ قلعہ کے اندر گھوڑے پر سوار ابراہیم پاشا کا مجسمہ ہے۔ یہی مجسمہ قاہرہ کے محلّہ ازبکیہ کے جنوب مشرقی حصہ میں بھی کھڑا ہے۔ قلعہ کے اندر تین مسجدیں ہیں: جامع احمد بن طولون، جامع سلیمان الخادم اور جامع محمد علی۔

جامع احمد بن طولون

اسے احمد بن طولون نے ۲۶۲ھ (۸۷۶ء) میں، یعنی قاہرہ کی بنیاد سے ایک صدی پہلے تعمیر کیا۔ وہ مصر کا خود مختار حاکم تھا، مگر خطبہ عباسی خلیفہ معتمد بن متوکل کے نام کا پڑھتا تھا۔ یہ قاہرہ کی چار دیواری کے اندر قدیم ترین اثر ہے۔ فسطاط کے مضافات میں المیدان (Al-Meidan) نامی شہر کو بسانے کے لیے ایک ایسے ٹیلے کا انتخاب کیا گیا جو نیل کے مشرقی کنارے سے لے کر جبل مقطم کے دامن تک پھیلا ہوا ہے۔ پرانے شہر کے آثار ابھی تک موجود ہیں اور یہ قدیم مسجد اس شہر کی عظمت و جلال کا زندہ شاہد ہے۔ اس کی تعمیر میں اٹھارہ برس لگے۔ احمد بن طولون ایک ایسی مسجد بنوانا چاہتا تھا جو جامع عمرو بن العاص سے خوب صورت اور وسیع تر ہو اور اس میں کم از کم تین سو ستون ہوں جو

مسجد کے دروازوں کو سہارا دیں، مگر اتنے ڈھیر سارے ستون پورے مصر میں ممفیس کے آثار کے علاوہ کہیں موجود نہ تھے۔ چنانچہ ایک قبطی ماہر فن تعمیر نے اسے مشورہ دیا کہ اتنی ہی خوب صورت مسجد بغیر کسی ستون کے تعمیر ہو سکتی ہے۔ صرف محراب میں ستون استعمال ہوں گے۔ چنانچہ اس کی نگرانی میں مسجد کی تعمیر ہوئی۔ رمضان ۲۶۳ھ میں احمد بن طولون نے مسجد کو نمازیوں کے لیے کھول دیا، مگر کوئی بھی نمازی اس خوف سے مسجد میں داخل نہ ہوا کہ کہیں اس کی تعمیر پر ناجائز طریقوں سے اکٹھا کیا ہوا پیسا خرچ نہ ہوا ہو، حاکم نے حلفیہ بیان دیا کہ ایسا کوئی پیسا خرچ نہیں ہوا تب جا کر لوگوں کو اطمینان ہوا اور وہ مسجد میں نماز پڑھنے کے لیے جانے لگے۔

مسجد کے گرد دو دیواریں ہیں تاکہ نماز ادا کرتے وقت بیرونی آوازیں مخل نہ ہوں۔ چھت کے نیچے لکڑی کے ایک ٹکڑے پر پورا قرآن خط کوفی میں کندہ ہے۔ عرب مورخین کا خیال ہے کہ لکڑی کا یہ ٹکڑا اس سفینۂ نوح کا حصہ ہے جس کے کچھ حصے احمد بن طولون کو آرمینیہ کے جبل ارارط پر ملے تھے۔ صحن کے عین وسط میں ایک گنبد آٹھ مرمری ستونوں پر کھڑا ہے۔ گنبد کی اندرونی چھت آسمانی رنگ کی ہے جس پر سنہری ستارے ٹمٹا رہے ہیں۔ مسجد کے بڑے دروازے کے قریب ایک چبوترہ سا ہے جس پر کھڑا ہو کر احمد عام نمازیں ادا کیا کرتا تھا۔ یہ چبوترہ ایک کمرے سے متصل ہے جس میں امیر اور اس کا خاندان تقریبات میں بیٹھا کرتے تھے۔ دیوار کے جنوب مغرب میں ایک مدرسہ کی جگہ ہے جہاں معلم بچوں کو دین اور شریعت کی تعلیم دیا کرتا تھا۔

جامع طولون عربی فن تعمیر کا نمونہ ہے، چاروں طرف برآمدے اس فن تعمیر کی شناخت ہیں۔ محراب چار ستونوں پر قائم ہے جن میں دو کالے سنگ مرمر کے بنے ہیں۔

منبر بندق (Hazel) کی لکڑی کا بنا ہوا ہے جس پر ہاتھی دانت کا کام ہوا ہے۔ وضو کا تالاب آج کل اسی جگہ پر واقع ہے جو ۶۹۴ھ (۱۲۹۴ء) میں جل گئی تھی۔ وضو کے تالاب کے اوپر ایک گنبد ہے جو جھکے ہوئے ستونوں پر کھڑا ہے جن پر خط نسخ میں تحریر موجود ہے۔ جامع مسجد کے تین مینار تھے جو منہدم ہو چکے ہیں۔ چونکہ اس مسجد میں نمازیں ادا نہ کی جاتی تھیں، اس لیے محمد علی پاشا نے ۱۸۴۷ء میں اس مسجد کو بڑی عمر کے لوگوں اور سدا بیمار لوگوں کے لیے ضیافت خانہ میں تبدیل کر دیا۔

آج کل یہ عظیم مسجد ویران ہے۔ اس کی وسیع دیواروں کے درمیان اذان کی آواز نہیں گونجتی۔ پتھر ہیں کہ لڑھک رہے ہیں، چھتیں ہیں کہ گر رہی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ مرور وقت کے ساتھ ساتھ عظمت رفتہ کی یہ نشانی مٹ جائے۔

جامع سلیمان الخادم

مسجد سلیمان الخادم بھی قلعہ کے اندر ہے۔اس کا سن تعمیر ۹۳۵ھ (۱۵۲۵ء) ہے۔طرز تعمیر ترکی ہے۔دوسری مساجد کی نسبت چھوٹی ہے۔قلعہ کے احاطہ کے اندر کچھ چھوٹی چھوٹی قبریں ہیں جو فوجی پہرے داروں کی معلوم ہوتی ہیں۔

جامع محمد علی

مسجد محمد علی پاشا یہ مصر کی خوب صورت ترین اور بلند ترین مسجد ہے جس پر اہل مصر بجا طور فخر کرتے ہیں۔اس کا طرز تعمیر خالص ترکی ہے۔مسجد کی عمارت کے اوپر ایک بلند گنبد ہے جس کے ارد گرد چار نصف گنبد ہیں جو بازنطینی طرز کے ہیں۔قاہرہ میں آپ جس جگہ سے بھی دیکھیں آپ کو یہ گنبد نظر آتے ہیں۔گنبد کے ساتھ دو انتہائی بلند اور نوکیلے مینار ہیں۔ ہندسی شکل میں ہر مینار کے آٹھ ضلعے ہیں۔ ہر مینار کے دو برآمدے ہیں جن کی چھت مخروطی شکل کی ہے۔ صحن کے ارد گرد بڑے دروازے ہیں جو خوب صورت شفاف سنگ مرمر کے بنے ہوئے ہیں۔درمیان میں وضو کے لیے فوارہ ہے جس کے ارد گرد آٹھ گول ستون ہیں۔ برج مربع شکل کا اور سنہری ہے۔شمال مغربی برآمدے کے اوپر وہ گھڑی لگی ہے جو فرانس کے بادشاہ لوئس فلپ (Luis Philip) نے محمد علی کو ہدیۃً دی تھی۔

جامع مسجد کے اندر داخل ہونے کا دروازہ سفید، شفاف اور ٹھنڈے سنگ مرمر سے بنا ہوا ہے۔نماز کے وسیع ہال میں ہلکی سی روشنی روشن دانوں سے اور گنبد میں لگے ہوئے رنگ برنگے شیشوں کے پرتو سے پڑتی ہے۔محراب جس میں عام طور پر خوب صورت پچکاری اور نقش و نگار بنے ہوتے ہیں، دیواروں کی مانند سادہ ہے تاکہ نمازی کی نماز میں خلل واقع نہ ہو۔فرش پر ایرانی قالین بچھے ہوئے ہیں۔دروازے کے دائیں طرف بانی کی قبر ہے، اس کے ارد گرد لوہے کی جالی ہے جس پر سونے کا پانی چڑھا ہوا ہے۔اس میں سات سوراخ ہیں جن کے اوپر نیلی زمین پر عربی کی تحریریں رقم ہیں۔ وہ محل جس میں محمد علی رہتا تھا، مشرق کے باقی محلات کی طرح باہر سے سادہ اور اندر سے عمدہ اور اچھوتا ہے۔وہ یورپی جلال کا مظہر ہے۔کرسیاں، میز اور شیشے سب پیرس سے منگوائے ہوئے ہیں۔ بہت ہی خوب صورت سنگ مرمر کی بنی ہوئی رہ گزریں اور سفید شفاف سنگ مرمر کے بنے ہوئے واش روم اعلیٰ ذوق کی غمازی کرتے ہیں۔وہاں سے آپ پورے قاہرہ شہر کا گنبدوں اور میناروں سمیت مشاہدہ کر سکتے ہیں۔دور سے دریاے نیل کے ساتھ ساتھ سرسبز و شاداب باغیچے عجیب منظر پیش کرتے ہیں۔کہیں کہیں کھجوروں کے باغات نظر آتے ہیں۔ دور بہت دور پر سکون صحرا حد نظر تک پھیلا ہوا ہے۔

مسجد سے باہر کھلا میدان ہے جہاں ایک کھوکھے سے ہم تینوں، یعنی میں، میری بیوی اور گائیڈ نے مشروبات لیے اور تھوڑی دیر سستائے۔ اس میدان کے کونے میں ایک کنواں ہے جو بئر یوسف کے نام سے مشہور ہے، یوسف سلطان صلاح الدین ایوبی کے چچا کا لقب تھا۔ یہ مربع شکل کا دومنزلہ کنواں ہے جو ایک چٹان میں کھدا ہوا ہے۔ اس کی گہرائی ۸۸.۳۰ میٹر ہے۔ اس کا بالائی حصہ قلعہ کا بلندترین نقطہ ہے۔ ایک دائری راستہ آہستہ آہستہ ڈھلوان سے اتر کر اس سطح پر پہنچتا ہے جہاں دومنزلیں علیحدہ ہو جاتی ہیں۔ یہ راستہ بھی چٹان کو تراش کر بنایا ہوا ہے۔ اس راستہ پر جالی لگی ہوئی ہے جو نیچے جانے والے راستہ کو روشن کرتی ہے۔ اگر اس زمانہ کو ذہن میں رکھا جائے جب یہ کنواں کھودا گیا تھا تو یہ حیرت انگیز کام معلوم ہوتا ہے۔ یہ کافی عرصہ تک پانی فراہم کرتا رہا ہے، لیکن جب سے پانی کی بڑی بڑی ٹینکیاں بنی ہیں، اس کی اہمیت کم ہوگئی ہے۔

قلعہ اور اس کی مساجد کی سیر کے بعد گائیڈ ہمیں جامع عمرو بن العاص کی طرف لے گیا۔

[باقی]

خالد مسعود

قرآن پر قریش کے اعتراضات

[''سیر وسوانح'' کے زیر عنوان شائع ہونے والے مضامین ان کے فاضل مصنفین کی اپنی تحقیق پر مبنی ہوتے ہیں، ان سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

شاعری اور کہانت

قرآن مجید نازل ہونا شروع ہوا تو ابتدائی سورتوں میں، جو مصحف کے آخری حصہ میں شامل ہیں، آیات نہایت گٹھے ہوئے، مختصر، لیکن جامع جملوں کی شکل میں تھیں۔ یہ کلام بے حد فصیح و بلیغ، اعجاز بیان کا کامل نمونہ، پر معانی اور پرشکوہ ہے۔ اس میں جلالت شان ہے۔ علاوہ ازیں اس میں قافیہ بندی پائی جاتی ہے۔ ان سورتوں میں اس دنیا کے خاتمہ، اس کے بعد پیش آنے والے واقعات، آخرت میں انسان کے محاسبہ اور جزا وسزا کا بکثرت ذکر ہے۔ ان تمام باتوں کا تعلق مستقبل یا ایک دوسرے جہان سے ہے۔ اس کلام کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

كَلَّا وَالْقَمَرِ. وَالَّيْلِ اِذْ اَدْبَرَ. وَالصُّبْحِ اِذَآ اَسْفَرَ. اِنَّهَا لَاِحْدَى الْكُبَرِ. نَذِيْرًا لِّلْبَشَرِ. لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّتَقَدَّمَ اَوْ يَتَاَخَّرَ. (المدثر ۷۴: ۳۲-۳۷)

ان آیات کے قافیہ میں ''ـَـ ر'' کی تکرار دیکھیے۔

اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ. وَاِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ. وَاِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ. وَاِذَا الْقُبُوْرُ بُعْثِرَتْ. عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَ اَخَّرَتْ. (الانفطار ۸۲: ۱-۵)

ان آیات میں تقریباً برابر جملوں کا اختتام قافیہ ''ـَـ تْ'' پر ہو رہا ہے۔

اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا. اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا. وَّاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا.

(المعارج ۷۰: ۱۹-۲۱)

یہاں جملے برابر طوالت کے ہیں اور ان کا اختتام ''ـَـ وْعًا'' پر ہوا ہے۔

كَلَّآ اِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ. وَ قِيْلَ مَنْ رَاقٍ. وظَنَّ اَنَّهُ الْفِرَاقُ. والْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ.
اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِ الْمَسَاقُ. (القیامہ ۷۵: ۲۶-۳۰)

یہاں تمام آیات ''ـَـ اق'' پر ختم ہو رہی ہیں۔

ان آیات میں قافیہ بندی دیکھیے تو شعروں کا گمان ہوتا ہے، لیکن شعر میں جو وزن ہوتا ہے، وہ ان میں نہیں ہے، لہٰذا یہ نثری کلام ہے۔ چھوٹے چھوٹے جملے، لیکن قافیہ کے ساتھ، اگر مماثلت رکھتے ہیں تو وہ کاہنوں کے کلام میں پائی جانے والی سجع سے ہے، لیکن یہاں کلام با مقصد، پر حکمت اور ایک واضح پیغام کا حامل ہے، جبکہ کاہنوں کا کلام تک بندی کی نوعیت کا ہوتا جس کا مدعا سمجھنا بھی مشکل ہوتا۔ ان آیات میں مستقبل کا تذکرہ دوٹوک انداز میں ہے جو ایک ان دیکھی حقیقت سے پردہ اٹھا رہا ہے۔ اس کے برعکس کاہنوں کی خبریں ذومعانی اور غیر یقینی ہوتیں۔ جہاں تک فصاحت و بلاغت کا تعلق ہے، وہ اس کلام میں بدرجہ اتم موجود ہے، لیکن یہ اس فصاحت سے کہیں زیادہ بلند و برتر ہے جو انسانوں کے یا خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذاتی کلام میں پائی جاتی ہے۔ اس کلام میں اس طرح کے بے معنی الفاظ بھی نہیں ہیں جو جادو کے منتروں میں ہوتے ہیں۔ ہر بات پر مغز، حقیقت افروز اور دل کو بھانے والی ہے۔ پورا قرآن اسی طرح کے فصیح و بلیغ کلام پر مشتمل ہے۔ اس کی خصوصیات کو دیکھتے ہوئے اس کو تنقید کا نشانہ بنانا اور اس کے مخالف جذبات ابھارنا کسی کے لیے بھی آسان نہیں۔ تاہم قریش نے پروپیگنڈا کی خاطر قرآن کو ہدف بنانے کا فیصلہ کیا۔ وہ اس کو کبھی شاعری، کبھی کہانت، کبھی انسانی کاوش اور کبھی جادو کہہ کر اس کی اہمیت کو کم کرنے کی کوشش کرتے۔

عرب بالعموم کلام کے حسن و قبح کو پہچاننے والے اور اس کے زبردست نقاد تھے، اس لیے قرآن کو شاعری قرار دینا اپنی نادانی کا ثبوت پیش کرنا تھا۔ لیکن ایک پہلو ایسا تھا جس کی رو سے قریش یہ غلط بات کر کے بھی اپنی بات کی لاج رکھ سکتے تھے۔ عربوں کا عقیدہ یہ تھا کہ ہر شاعر کسی جن کے زیر اثر اپنا کلام پیش کرتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ بتاتے تھے کہ میرے اوپر فرشتۂ وحی کلام نازل کرتا ہے، قریش اس کو آپ کی غلط فہمی قرار دیتے کہ آپ جس کو فرشتہ سمجھتے ہیں، وہ حقیقت میں جن ہے جو شاعروں پر کلام کا الہام کرتا ہے۔

عربوں میں کاہنوں کی بڑی قدر تھی جو غیب دانی کے دعوے دار تھے۔ لوگ کسی معاملہ میں مشورہ لینے کے لیے ان

سے رجوع کرتے تو کاہن مراقبہ کر کے جنات وشیاطین کے ساتھ رابطہ قائم کرنے کا ڈھونگ رچاتے۔ پھر وہ کچھ ایسا کلام سناتے جس کے فقرے مختصر اور قافیہ کے ساتھ ہوتے۔ اس مقفّٰی و مسجع عبارت کے متعلق ان کا دعویٰ یہ ہوتا کہ ان کو اس کا الہام ہوا ہے۔ اس عبارت سے ایک سے زیادہ معانی نکالنا ممکن ہوتا۔ اس میں مستقبل کے بارے میں پیشین گوئی کا عنصر بھی شامل ہوتا۔ قریش جب قرآن کو کہانت سے تعبیر کرتے تو ان کے پیش نظر ابتدائی سورتوں کے مختصر جملے، آیات میں قافیہ اور سجع کا اہتمام اور امور غیب کے بارے میں رہنمائی جیسی چیزوں کا اہتمام ہوتا۔ وہ اس کو کسی جن سے رابطہ کا نتیجہ قرار دیتے۔

قریش کا پروپیگنڈا درست نہیں تھا۔ اس کے اسباب بالکل واضح ہیں: اولاً، یہ کہ شاعروں کی شاعری ان کے احساسات و جذبات اور وجدان پر مبنی ہوتی ہے۔ ان کے دل پر جو کچھ وارد ہوتا ہے، وہ اس کو کسی اچھوتے اسلوب میں شعر موزوں کر کے پیش کر دیتے ہیں۔ انھیں اس سے بحث نہیں ہوتی کہ اگر کل انھوں نے کسی نیک جذبہ کے تحت اچھا شعر کہا تھا تو آج اس کے برعکس بے حیائی کا مضمون کیوں باندھ رہے ہیں۔ بڑے سے بڑے شاعر کا کلام پڑھیے تو معلوم ہوگا کہ وقتی جذبات واحساسات کے تحت انھوں نے نیک اور بد ہر طرح کی باتیں کہہ رکھی ہیں۔ ان کے جوانی اور بڑھاپے کے کلام میں نمایاں فرق دیکھا جا سکتا ہے۔ ایک جگہ وہ رند شاہد باز نظر آتے ہیں تو دوسرے مقام پر پارسا اور ولی دکھائی دیتے ہیں۔ ثانیاً، شاعر صرف گفتار کے غازی ہوتے ہیں، کردار کی ان کے ہاں اہمیت نہیں ہوتی۔ ان کے کلام میں اللہ ورسول کی اطاعت کا پیغام ہوگا، لیکن اپنا عمل اطاعت کے معانی سے نا آشنا ہوگا۔ وہ مسائل تصوف بیان کریں گے، لیکن اپنا محبوب شغل بادہ خواری ہوگا۔ رجزیہ کلام میں شجاعت وشہامت کا مضمون باندھتے ہوئے آسمان اور زمین کے قلابے ملا دیں گے، لیکن بزدلی کا یہ عالم ہوگا کہ ایک چھپکلی دیکھ کر ان پر لرزہ طاری ہو جائے گا۔ ثالثاً، شاعروں کے کلام میں ہر طرح کے لوگوں کو اپنے مطلب کے مضامین مل جاتے ہیں اور وہ ان کے مداح بن جاتے ہیں۔ ان میں جہاں کچھ اچھے لوگ ان سے متاثر ہوتے ہیں، وہیں گمراہ، شر پسند اور اوباش لوگ بھی ان کے نام کا جھنڈا اٹھا لیتے ہیں۔

شاعری کی ان خصوصیات اور شاعروں کے اس کردار کے برعکس نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر جو کلام نازل ہو رہا تھا، اس کا ایک متعین ہدف تھا جس سے کہیں انحراف نظر نہیں آتا تھا۔ جو بات انھوں نے پہلے دن کہی ساری عمر مختلف اسالیب میں اسی کی وضاحت کرتے رہے۔ اس سے سرمو ہٹنے کی کبھی نوبت نہیں آئی۔ حقیقت میں یہی چیز قریش کے لیے باعث تشویش بھی تھی۔ مثلاً، اگر توحید کا مضمون اتفاقی طور پر کبھی کبھی سامنے آیا ہوتا تو وہ اس کو برداشت کرتے رہتے۔

اس مضمون کی تکرار ہی اصل میں ان کے نظام پر ضرب لگاتی تھی اور یہ بات ان کے لیے سوہان روح تھی۔ پھر آپ جو کچھ پیش کر رہے تھے نہ صرف اس پر خود عمل کر رہے تھے، بلکہ اپنے تمام ساتھیوں کے اندر بھی اسی عمل کی نمود چاہتے تھے۔اس کا نتیجہ یہ تھا کہ آپ کی تربیت سے معاشرے کے بہترین افراد کی ایک بڑی جماعت تیار ہو رہی تھی جن کے قول و عمل میں کوئی تضاد نہ تھا۔ وہ جس بات کو درست تسلیم کر رہے تھے،اس کے لیے ایثار و قربانی کا جذبہ بھی رکھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کو دیکھ کر دوسرے لوگ بھی اسی چشمہ سے سیراب ہونے کے خواہش مند ہوتے جس سے ان فرشتہ سیرت لوگوں نے فیض پایا تھا۔ چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں اصل قدر و قیمت عمل صحیح کی تھی، اس لیے کوئی آوارہ اور فضول شخص آپ کے ساتھیوں میں شامل ہو ہی نہ سکتا تھا۔قرآن نے قریش کو بار بار توجہ دلائی کہ سوچو، پیغمبر کے ساتھی آخر معاشرے کے صالح اور خداترس افراد کیوں بن رہے ہیں؟ آوارہ منش لوگوں کو یہ کلام کیوں اپیل نہیں کر رہا ہے؟ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ پیغمبر اعلیٰ اقدار کو معاشرہ میں رواج دے رہے ہیں۔ وہ رب کی بندگی، بندوں کے لیے ایثار اور غریبوں کے لیے مواسات اور رحم دلی کا ہدف اگر دوسروں کے سامنے رکھتے ہیں تو سب سے آگے بڑھ کر اس ہدف کو خود حاصل کرنے کی جدوجہد بھی کر رہے ہیں، اور اسی کو دلائل سے بھی ثابت کر رہے ہیں۔ یہی وہ چیز ہے جو اچھے اور نیک طینت لوگوں کو اپیل کر رہی ہے۔اگر پیغمبر ایک شاعر ہوتے تو دوسرے شاعروں سے مختلف نہ ہوتے۔

قریش کا قرآن کو کہانت کہنا بھی ایک دور کی کوڑی لانے کے مترادف تھا۔اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن جیسا پاکیزہ، بامقصد، خداترسی اور خدمت خلق کی دعوت دینے والا کلام شیاطین کی بری فطرت کے ساتھ کوئی مطابقت نہیں رکھتا۔شیاطین کے مقاصد کے ساتھ مطابقت رکھنے والا وہی کلام ہوسکتا ہے جو شیطانی مقاصد پورا کرنے کے لیے موزوں ہو۔ پاکیزہ کلام اتار کر اور نیکی کا چرچا کر کے وہ اپنے ہی پاؤں پر کیوں کلہاڑی ماریں گے۔ پھر کلام اللہ کاہنوں کے کلام سے مختلف بھی ہے۔اس جیسا فصیح و بلیغ کلام کہنا کاہنوں اور ان کے شیطانوں کے بس کی بات نہیں۔شیطان اپنی باتوں کا القا کسی نیک سرشت والے آدمی پر نہیں کرتے۔ باطل کو پسند کرنے والے جھوٹے لوگ ان سے متاثر ہوتے ہیں جو مکر و فریب کے ذریعے لوگوں کو بے وقوف بنا کر کہانت کی دکان چمکاتے ہیں۔ یہ لوگ اخلاقی اعتبار سے بے حد پست ہوتے ہیں۔ جہاں تک کاہنوں کی دی ہوئی خبروں کا تعلق ہے،ان میں سچ اور جھوٹ کی آمیزش ہوتی ہے، کیونکہ جنات و شیاطین کو بارگاہ الٰہی کے معاملات تک رسائی حاصل نہیں ہے۔ان کے پاس خرافات کا ذخیرہ ہوتا ہے۔ان کا القا جھوٹ پر مبنی ہوتا ہے۔اس کے برعکس پیغمبر روح القدس سے فیض پاتا اور صداقت و امانت میں اپنا مثیل نہیں رکھتا ہے۔

انسانی کاوش

قرآن اپنے پیغام کو جب دلائل سے ثابت کرتا اور لوگ اس سے متاثر ہو کر یہ سوچتے کہ اس قسم کا پر مغز کلام اللہ تعالیٰ کی رہنمائی کے بغیر کوئی شخص کیسے پیش کر سکتا ہے اور وہ لیڈروں کے پاس آ کر اپنا وسوسہ بتاتے تو لیڈر ان کو قائل کرنے کی کوشش کرتے کہ یہ کلام محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہی کے ذہن کی پیداوار ہے، البتہ وہ تنہا یہ کام نہیں کر رہا ہے، بلکہ بعض عجمی لوگ اور کچھ اہل کتاب اس کے ساتھی بن گئے ہیں اور وہ سب مل کر یہ کلام گھڑتے ہیں اور جتنا بنا چکتے ہیں، اتنا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) آکر پیش کر دیتے ہیں اور اس کا اعتبار قائم کرنے کے لیے اس کو منسوب خدا کی طرف کر دیتے ہیں۔ اگر یہ اللہ کا کلام ہوتا تو اللہ کو تو سوچ سوچ کر اتارنے کی ضرورت نہ تھی۔ قریش کا یہ اعتراض بھی بے جان تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن انتہائی معیاری عربی میں ہے۔ ایسا کلام تخلیق کرنا کسی عجمی کے بس کی بات ہے اور نہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا ذاتی کلام اس نوعیت کا ہے۔ قرآن اگر انسانی تصنیف ہوتا تو قریش کے پاس نہ بہترین شاعروں کی کمی تھی نہ اعلیٰ خطیبوں کی۔ ایسے بیسیوں افراد مہیا کرنا کچھ مشکل نہ تھا جو قرآن جیسا کلام تخلیق کر لیتے۔ قرآن کے مشابہ کلام وضع کرنا ممکن نہ تھا، اسی لیے جب قریش کو ایک ہی پُر حکمت سورہ بنا کر پیش کرنے کی دعوت دی گئی تو آخر انھوں نے اس چیلنج کا مقابلہ کیوں نہ کیا۔ باقی رہا یہ سوال کہ قرآن یکبارگی کیوں نہ اتارا گیا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ کوئی بھی سنجیدہ اور پُر حکمت چیز فی الفور ذہنوں میں اتاری نہیں جا سکتی، اگر اس کی تعلیم دینا اور تفہیم کرنا مطلوب ہو۔ ایک ناول تو ایک ہی نشست میں پڑھا اور سمجھا جا سکتا ہے، لیکن سائنس یا فلسفہ کی کوئی کتاب اس طرح پڑھنا اور سمجھ لینا ممکن نہیں ہوتا۔ قرآن کے نزول میں معاملہ اللہ کی قدرت کا نہیں، بلکہ انسانوں کے تحمل کی صلاحیت کا ہے۔

سحر

قرآن کی دعوت جس طرح لوگوں کو فتح کر رہی تھی، اس سے یہ بات واضح تھی کہ یہ کلام جہاں فصیح و بلیغ ہونے میں اپنا ثانی نہیں رکھتا، وہیں نہایت زود اثر بھی ہے۔ جب کوئی شخص اس کو سن لیتا ہے تو وہ نہ صرف اس کلام سے مسحور ہو جاتا ہے، بلکہ اس کی خاطر خاندان اور قبیلے کو بھی خاطر میں نہیں لاتا۔ اس بنا پر قرشی سردار قرآن کو جادو سے تعبیر کرتے۔ یہ معاملہ قرآن ہی کے ساتھ پیش نہیں آیا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جو پیغام پیش کیا، اس کو بھی مخالفین سحر قرار دیتے۔ قریش کا یہ موقف بھی نادرست تھا۔ کلام وحی اور سحر میں کوئی چیز مشترک نہیں۔ ساحروں کے شعبدوں کی چمک دمک عارضی ہوتی ہے، وہ کبھی پائیدار کامیابی حاصل نہیں کر سکتے۔ سحر کے اثرات وقتی اور بہت جلد زائل ہونے والے

ہوتے ہیں جبکہ قرآن نے لوگوں کے قلوب واذہان کو بدل کر رکھ دیا۔ سحر باطل ہوتا اور حق کے مقابلہ میں آ کر بودا ثابت ہوتا ہے جبکہ قرآن سراپا حق ہے اور جب یہ حق باطل کے ساتھ ٹکرایا تو اس کو سرنگوں کر دیا۔ قریش دیکھ رہے تھے کہ قرآن کے حق کی ان کے باطل کے ساتھ پنجہ آزمائی کامیابی سے ہمکنار ہو رہی ہے اور ہر آنے والا دن باطل کو پسپا ہونے پر مجبور کر رہا ہے۔ جادو کے اثر سے کردار کی تعمیر ممکن نہیں ہوتی جبکہ قرآن نہایت اعلیٰ کردار کے افراد تیار کر رہا تھا۔ لہٰذا قریش کا پروپیگنڈا سادہ لوح عوام کو مطمئن کرتا رہا ہوگا یا ان کے خوشامدی اس سے ان کے ہم نوا ہو گئے ہوں گے، لیکن عاقل وفرزانہ اس سے متاثر نہیں ہو سکتے تھے۔

قرآن کی حیثیت

قریش کے پروپیگنڈے کا جواب مختلف پیرایوں میں خود قرآن میں دیا گیا اور ان کو ذہنی خلجان سے نکالنے کے لیے اس کلام کی حیثیت بار بار واضح کی گئی جس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پیش کر رہے تھے۔ مقصد یہ تھا کہ حق پسند طبیعتیں قومی تعصب سے نکلیں اور رسول اللہ کی دعوت کے لیے اپنے کان کھولیں۔ مختلف سورتوں میں کلام کے منبع، اس کو لانے والے فرشتے کی صفات وخصوصیات اور اس کو وصول کرنے اور لوگوں تک پہنچانے والے رسول، سب کے بارے میں روشنی ڈالی گئی۔ چند آیات ملاحظہ ہوں:

فَلَآ اُقۡسِمُ بِمَا تُبۡصِرُوۡنَ. وَمَا لَا تُبۡصِرُوۡنَ. اِنَّهٗ لَقَوۡلُ رَسُوۡلٍ كَرِيۡمٍ. وَّمَا هُوَ بِقَوۡلِ شَاعِرٍ. قَلِيۡلًا مَّا تُؤۡمِنُوۡنَ. وَلَا بِقَوۡلِ كَاهِنٍ. قَلِيۡلًا مَّا تَذَكَّرُوۡنَ. تَنۡزِيۡلٌ مِّنۡ رَّبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ. (الحاقہ ۶۹: ۳۸-۴۳)

’’پس نہیں، میں قسم کھاتا ہوں ان چیزوں کی جن کو تم دیکھتے ہو، اور ان چیزوں کی بھی جن کو تم نہیں دیکھتے کہ بے شک یہ ایک باعزت رسول کا لایا ہوا کلام ہے، اور یہ کسی شاعر کا کلام نہیں۔ تم بہت ہی کم ایمان لاتے ہو۔ اور یہ کسی کاہن کا بھی کلام نہیں۔ تم بہت ہی کم سمجھتے ہو۔ یہ خداوند عالم کی طرف سے اتارا ہوا ہے۔‘‘

فَلَآ اُقۡسِمُ بِالۡخُنَّسِ الۡجَوَارِ الۡكُنَّسِ. وَالَّيۡلِ اِذَا عَسۡعَسَ. وَالصُّبۡحِ اِذَا تَنَفَّسَ. اِنَّهٗ لَقَوۡلُ رَسُوۡلٍ كَرِيۡمٍ. ذِىۡ قُوَّةٍ عِنۡدَ ذِى الۡعَرۡشِ مَكِيۡنٍ. مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيۡنٍ. وَمَاصَاحِبُكُمۡ بِمَجۡنُوۡنٍ. وَلَقَدۡ رَاٰهُ بِالۡاُفُقِ

’’پس نہیں، میں قسم کھاتا ہوں پیچھے ہٹنے والے، چلنے والے اور چھپ جانے والے (ستاروں) کی، اور رات کی جب وہ جانے لگتی ہے، اور صبح کی جب وہ سانس لیتی ہے، کہ لاریب یہ ایک باعزت رسول کا لایا ہوا کلام ہے۔ وہ بڑا ہی قوت والا اور عرش والے کے

الْـمُبِيْنِ. وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِيْنٍ. وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ. فَاَيْنَ تَذْهَبُوْنَ. (التکویر۸۱: ۱۵-۲۶)

نزدیک بڑا ہی بارسوخ ہے۔ اس کی بات مانی جاتی اور وہ نہایت امین بھی ہے۔ اور تمھارا یہ ساتھی (نبی صلی اللہ علیہ وسلم) کوئی خبطی نہیں ہے۔ اور اس نے اس کو کھلے افق میں دیکھا ہے۔ اور یہ غیب کی باتوں کا کوئی حریص نہیں ہے۔ اور یہ کسی شیطان رجیم کا القا نہیں ہے۔ تو تم کہاں کھوئے جاتے ہو؟''

وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ. نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ. عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ. بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ. وَ اِنَّهٗ لَفِيْ زُبُرِ الْاَوَّلِيْنَ. اَوَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ اٰيَةً اَنْ يَّعْلَمَهٗ عُلَمٰٓؤُا بَنِيْٓ اِسْرَآءِ يْلَ. (الشعراء۲۶: ۱۹۲-۱۹۷)

''اور بے شک یہ نہایت اہتمام سے خداوند عالم کا اتارا ہوا ہے۔ اس کو تمھارے قلب پر امانت دار فرشتہ لے کر اترا ہے تاکہ تم لوگوں کو آگاہ کر دینے والوں میں سے بنو۔ واضح عربی زبان میں۔ اور اس کا ذکر اگلوں کے صحیفوں میں بھی ہے۔ کیا ان لوگوں کے لیے یہ نشانی کافی نہیں ہے کہ اس کو علماے بنی اسرائیل جانتے ہیں۔''

ان آیات سے واضح ہوتا ہے کہ جہانوں کے مالک نے اپنے منصوبہ کے تحت اپنے بندوں کی رہنمائی کے لیے نہایت اہتمام سے اپنا کلام اتارا۔ اس کے نازل کرنے کے لیے جس فرشتہ کا انتخاب کیا، وہ نہایت قوی اور مضبوط، عقل اور کردار میں محکم اور امانت دار ہے۔ ذمہ داری ادا کرنے میں وہ خیانت کا مرتکب نہیں ہوتا۔ وہ اعلیٰ صلاحیتوں سے مالا مال ہے۔ کوئی دوسرا اس کو متاثر یا مرعوب نہیں کر سکتا۔ وہ کسی سے دھوکا کھاتا اور نہ کسی کے ہاتھ بک سکتا ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کے کلام میں کسی باطل کی آمیزش خارج از امکان ہے۔ اس مقرب فرشتہ نے نبی کو نہایت اہتمام، توجہ اور شفقت سے اس وحی کی تعلیم دی جو اللہ نے اس پر نازل کرنی چاہی۔ نبی کو ذاتی طور پر غیب دانی کا چسکا نہیں ہے۔ وحی الٰہی کی ذمہ داری تو بے سان و گمان اس پر آ پڑی ہے اور وہ اس کو نباہ رہا ہے۔ یہ نبی کے ذہن کی پیداوار نہیں ہے۔ وحی کی زبان نہایت معیاری اور واضح عربی ہے جس کی کوئی نظیر موجود نہیں۔ اس کی تعلیم میں کوئی کج پیچ نہیں۔ اس کی رہنمائی بالکل فطری، عقلی اور سیدھی راہ کی طرف ہے جس کے دلائل عقل و فطرت، کائنات، اور انسانی نفسیات میں موجود ہیں۔ ان حقائق کے باوجود بھی قریش اگر اس کلام کی مخالفت کرتے ہیں تو یہ ان کے تعصب، تکبر اور ذاتی مفادات کے باعث ہے۔

زائرین کے لیے قریش کا یکساں موقف

مکہ تمام قبائل عرب کا دینی مرکز تھا اور عرب حج اور عمرہ کی عبادات سے شغف رکھتے تھے، اس لیے مکہ میں ان کی آمد و رفت بکثرت ہوتی۔ قریش کو یہ پریشانی لاحق ہوئی کہ باہر سے آنے والے لوگ مکہ آ کر جب ایک پیغمبر کی بعثت کی خبر سنیں گے تو قدرتی طور پر ان کو اس کے بارے میں جاننے کی خواہش ہو گی۔ وہ مسلمانوں سے ملیں گے تو دعوت قبائل عرب میں بھی پھیل سکتی ہے۔ لہٰذا اس کے تدارک کے لیے اقدام کی ضرورت ہے۔ ولید بن مغیرہ کو، جو قریش کا ایک عمر رسیدہ اور زیرک سردار تھا، اس ضرورت کا احساس ہوا تو اس نے دوسرے سرداروں کے سامنے تجویز پیش کی کہ باہر کے لوگوں کے سامنے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بارے میں الگ الگ رائے ظاہر کر کے ان میں اس سے بالمشافہ ملاقات کا اشتیاق پیدا کرنے کے بجائے ہمیں متفق الرائے ہو کر ایک ہی بات بتانی چاہیے۔ طے ہوا کہ سب لوگ ایک ممکن و موزوں جواب سوچ کر آئیں تاکہ تمام آرا پر غور کر کے کسی ایک بات پر اتفاق کر لیا جائے۔ جب مجلس منعقد ہوئی تو ولید نے آرا طلب کیں۔ کچھ لوگوں نے کہا: ہم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے کلام کو کہانت کہیں گے۔ ولید نے کہا: ہم نے کاہن دیکھ رکھے ہیں اور ان کا کلام بھی سن رکھا ہے۔ اللہ کی قسم، محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا کلام نہ تو کاہنوں کے خفیہ کلام کی طرح ہے نہ اس کی مماثلت ان کی قافیہ بندی سے ہے۔ کچھ لوگوں نے تجویز پیش کی کہ ہمیں یہ کہنا چاہیے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو جنون لاحق ہو گیا ہے۔ ولید نے کہا: ہم جنونیوں کو پہچانتے ہیں۔ ان کے دماغوں میں خلجان ہوتا اور وسوسے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ چیز محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) میں نہیں پائی جاتی۔ کچھ لوگوں کی رائے تھی کہ ہمیں چاہیے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو بطور شاعر پیش کر دیں۔ ولید نے کہا کہ شاعری کی تمام اقسام اور ان کی خصوصیات سے ہم آگاہ ہیں، شعر کی پرکھ کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ قرآن میں جب شاعری کی یہ خصوصیات مفقود ہیں تو ہمارا یہ موقف کون مانے گا۔ لوگوں نے کہا: پھر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ساحر کہہ دینا چاہیے۔ ولید نے کہا: ہم نے ساحروں کو دیکھا ہے۔ وہ منتر پڑھتے، پھونکیں مارتے اور گرہیں لگاتے ہیں۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ایسا نہیں کرتے۔ اس پر لوگوں نے کہا: اے ابو عبد شمس، پھر آپ ہی ہمیں کوئی رائے دیں، ہم اسی پر قائم رہیں گے۔ اس نے جواب دیا: اللہ کی قسم، محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پیش کردہ کلام میں شیرینی ہے۔ یہ پاتال میں اترا ہوا ایک ایسا درخت ہے جس کی شاخیں ثمر آور ہیں۔ ان تمام باتوں میں سے جو کچھ بھی تم کہو گے، وہ صاف جھوٹ مانا جائے گا۔ البتہ اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ساحر کہو تو اس کا ایک محل ہو سکتا ہے۔ وہ یہ کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا کلام جادو کا سا اثر رکھتا ہے۔ جس طرح جادو کے عمل سے محبت والفت یا نفرت وعداوت کے جذبات پیدا کیے جاتے ہیں، اسی طرح

اس کلام سے آدمی اور اس کے باپ، بیٹے یا بھائی کے درمیان، اور شوہر اور بیوی کے درمیان، اور آدمی اور اس کے قبیلہ کے درمیان تفریق پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ طے ہوا کہ مکہ آنے والوں میں سے اگر کوئی شخص محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بارے میں رائے طلب کرے تو سب اس کے کلام کو جادو کہیں اور کلام کے اس نتیجہ سے ڈرائیں۔ ولید کی اس تجویز پر قریش نے عمل کیا لیکن پھر بھی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہوا[1]۔

کتب سیرت میں بیان ہوا ہے کہ قبیلہ دوس کے ایک سردار طفیل بن عمرو ایک باصلاحیت آدمی تھے۔ وہ عمرہ کے لیے مکہ گئے تو وہاں سنا کہ ایک شخص نے نبوت کا دعویٰ کر رکھا ہے اور لوگ اس کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں۔ انھوں نے قریش میں اپنی جان پہچان والوں سے دریافت کیا تو ہر ایک نے ان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے متنفر کیا اور آپ کے سایہ سے بھی بچ کر رہنے کی تلقین کی۔ قریش نے ان کو بتایا کہ اس شخص کے پاس ایک ایسا جادو ہے جو میاں اور بیوی کے درمیان تفریق پیدا کر دیتا ہے۔ طفیل کچھ روز تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سامنا کرنے سے کتراتے رہے۔ مسجد میں آتے تو کانوں میں روئی ٹھونس لیتے تاکہ مدعی نبوت کی کوئی بات کان میں نہ پڑ جائے۔ اتفاق سے ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز ادا کر رہے تھے کہ چند آیات ان کے کان میں پڑ گئیں۔ انھوں نے سوچا کہ میں ایک عاقل، جہاں دیدہ اور نیک و بد میں تمیز کی صلاحیت رکھنے والا آدمی ہوں۔ خود شاعر ہوں اور شاعرانہ کلام کی پرکھ کر سکتا ہوں۔ آخر ایک آدمی مجھے کیسے ورغلا سکتا ہے جبکہ میں اس کی طرف سے محتاط بھی ہوں۔ یہ سوچ کر طفیل انتظار میں رہے۔ جب آپ عبادت سے فارغ ہو کر گھر جانے لگے تو وہ آپ کے پیچھے ہو لیے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر پہنچ کر ملاقات کی خواہش کی۔ آپ نے اجازت دی تو انھوں نے اپنا تعارف کرایا اور بتایا کہ میں نے سنا ہے کہ آپ کوئی جادو اثر کلام سناتے ہیں۔ پہلے تو میں اجتناب کرتا رہا تاکہ آپ کا کلام میرے کانوں میں پڑ کر مجھے گمراہ کرنے کا باعث نہ بن جائے، لیکن اب میں نے سوچا کہ اس کو سننا تو چاہیے، اس لیے حاضر ہوا ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو قرآن سنایا تو طفیل اس قدر متاثر ہوئے کہ اسی وقت مسلمان ہو گئے۔ جب اپنے قبیلہ میں لوٹے تو اپنے والد اور بیوی کو بھی مسلمان کر لیا۔ بعد میں ان کی دعوت سے قبیلہ دوس کے مزید کئی افراد مسلمان ہوئے[2]۔

(جناب خالد مسعود صاحب کی تصنیف ''حیات رسول امی صلی اللہ علیہ وسلم'' سے انتخاب)

---

[1] السیرۃ النبویہ، ابن ہشام ۱/۲۷۰۔

[2] ایضاً، ص ۳۸۲۔

جاوید احمد غامدی

اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے۔ میں نے اِس دین کو جس طرح سمجھا ہے، اپنی کتاب ''میزان'' میں بیان کر دیا ہے۔ یہ اِسی کتاب کا خلاصہ ہے جس میں کتاب کا نفس مضمون اُس کے علمی مباحث اور اُن کے استدلالات سے الگ کر کے سادہ طریقے پر پیش کر دیا گیا ہے۔

—— جاوید

قانون عبادات

دین کا مقصد تزکیہ ہے۔ اِس کے منتہاے کمال تک پہنچنے کا ذریعہ اللہ اور بندے کے درمیان عبد و معبود کے تعلق کا اُس کے صحیح طریقے سے قائم ہو جانا ہے۔ یہ تعلق جتنا محکم ہوتا ہے، انسان اپنے علم و عمل کی پاکیزگی میں اتنا ہی ترقی کرتا ہے۔ محبت، خوف، اخلاص و وفا اور اللہ تعالیٰ کی بے پایاں نعمتوں اور بے نہایت احسانات کے لیے احساس و اعتراف کے جذبات، یہ اِس تعلق کے باطنی مظاہر ہیں۔ انسان کے شب و روز میں اِس کا ظہور بالعموم تین ہی صورتوں میں ہوتا ہے: پرستش، اطاعت اور حمیت و حمایت۔ انبیا علیہم السلام کے دین میں عبادات اِسی تعلق کی یاددہانی کے لیے مقرر کی گئی ہیں۔ نماز اور زکوٰۃ پرستش ہے۔ قربانی اور عمرہ کی حقیقت بھی یہی ہے۔ روزہ و اعتکاف اطاعت اور حج اللہ تعالیٰ کے لیے حمیت و حمایت کا علامتی اظہار ہے۔

نماز

اِن میں اہم ترین عبادت نماز ہے۔ دین کی حقیقت، اگر غور کیجیے تو معبود کی معرفت اور اُس کے حضور میں خوف و محبت کے جذبات کے ساتھ خضوع و تذلل ہی ہے۔ اِس حقیقت کا سب سے نمایاں ظہور پرستش ہے۔ تسبیح و تحمید، دعا و

مناجات اور رکوع و سجود اِس پرستش کی عملی صورتیں ہیں۔ نماز یہی ہے اور اِن سب کو غایت درجہ حسن توازن کے ساتھ اپنے اندر جمع کر لیتی ہے۔

دین میں اِس عبادت کی اہمیت غیر معمولی ہے۔ ایمانیات میں جو حیثیت توحید کی ہے، وہی اعمال میں نماز کی ہے۔ یہ خدا کی یاد کو قائم رکھنے کے لیے فرض کی گئی ہے۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ آیات الٰہی کی تذکیر سے خدا کی جو معرفت حاصل ہوتی ہے اور اُس سے اللہ تعالیٰ کے لیے محبت اور شکرگزاری کے جو جذبات انسان کے اندر پیدا ہوتے ہیں یا ہونے چاہییں، اُن کا پہلا ثمرہ یہی نماز ہے۔ یہ اسلام کا ستون ہے، دنیا اور آخرت میں آدمی کے مسلمان سمجھے جانے کی شرائط میں سے ہے، دین پر قائم رہنے کا ذریعہ ہے، مشکل کشا ہے، گناہوں کو مٹاتی ہے، دعوت حق کی پہچان ہے، راہ حق میں استقامت کی بنیاد ہے، کائنات کی فطرت ہے، حقیقی زندگی ہے۔ خدا کی معرفت، اُس کا ذکر و فکر اور اُس کی قربت کا احساس جب منتہاے کمال کو پہنچتا ہے تو نماز بن جاتا ہے۔ دنیا کے سب عارفوں کا فیصلہ ہے کہ اصل زندگی دل کی زندگی ہے اور دل کی زندگی یہی معرفت، ذکر و فکر اور قربت الٰہی ہے۔ یہ زندگی انسان کو صرف نماز سے حاصل ہوتی ہے اور نماز ہی سے باقی رہتی ہے۔

اِس کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے، جتنی خود مذہب کی ہے۔ اِس کا تصور تمام مذاہب میں رہا ہے اور اِس کے مراسم اور اوقات بھی کم و بیش متعین رہے ہیں۔ ہندووں کے بھجن، پارسیوں کے زمزمے، عیسائیوں کی دعائیں اور یہودیوں کے مزامیر، سب اِسی کی یادگاریں ہیں۔ قرآن نے بتایا ہے کہ اللہ کے تمام پیغمبروں نے اِس کی تعلیم دی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت جس دین ابراہیمی کی تجدید کے لیے ہوئی، اُس میں بھی اِس کی حیثیت سب سے نمایاں ہے۔ قرآن نے جب لوگوں کو اِس کا حکم دیا تو یہ اُن کے لیے کوئی اجنبی چیز نہ تھی۔ وہ اِس کے آداب و شرائط اور اعمال و اذکار سے پوری طرح واقف تھے۔ چنانچہ اِس بات کی کوئی ضرورت نہ تھی کہ قرآن اِس کی تفصیلات بیان کرتا۔ دین ابراہیمی کی ایک روایت کی حیثیت سے یہ جس طرح ادا کی جاتی تھی، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کے حکم پر بعض ترامیم کے ساتھ اِسے ہی اپنے ماننے والوں کے لیے جاری فرمایا اور نسلاً بعد نسلٍ، وہ اُسی طرح اِسے ادا کر رہے ہیں۔

نماز کے شرائط

نماز کے لیے جن چیزوں کا اہتمام ضروری ہے، وہ یہ ہیں:

نماز پڑھنے والا نشے میں نہ ہو،

وہ اگر عورت ہے تو حیض ونفاس کی حالت میں نہ ہو،

وہ باوضو ہو اور حیض ونفاس یا جنابت کے بعد اُس نے غسل کر لیا ہو،

سفر، مرض یا پانی کی نایابی کی صورت میں، یہ دونوں مشکل ہو جائیں تو وہ تیمّم کر لے،

قبلہ کی طرف رخ کر کے نماز کے لیے کھڑا ہو۔

وضو کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے منہ دھویا جائے، پھر کہنیوں تک ہاتھ دھوئے جائیں، پھر پورے سر کا مسح کیا جائے اور اِس کے بعد پاؤں دھو لیے جائیں۔

وضو اگر ایک مرتبہ کر لیا جائے تو اُس وقت تک قائم رہتا ہے، جب تک کوئی ناقض حالت آدمی کو پیش نہ آ جائے۔ چنانچہ وضو کی یہ ہدایت اُس حالت کے لیے ہے، جب وضو باقی نہ رہا ہو، اِلّا یہ کہ کوئی شخص نشاطِ خاطر کے لیے تازہ وضو کر لے۔

اِس کے نواقض درج ذیل ہیں:

۱۔ پیشاب کرنا۔

۲۔ پاخانہ کرنا۔

۳۔ ریح کا خارج ہونا، خواہ آواز سے ہو یا آہستہ۔

۴۔ مذی یا ودی کا خارج ہونا۔

سفر، مرض یا پانی کی نایابی کی صورت میں وضو اور غسل، دونوں مشکل ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ نے اجازت دی ہے کہ آدمی تیمّم کر سکتا ہے۔ اِس کا طریقہ یہ ہے کہ کوئی پاک جگہ دیکھ کر اُس سے چہرے اور ہاتھوں کا مسح کر لیا جائے۔ یہ ہر قسم کی نجاست میں کفایت کرتا ہے۔ وضو کے نواقض میں سے کوئی چیز پیش آ جائے تو اِس کے بعد بھی کیا جا سکتا ہے اور مباشرت کے بعد غسل جنابت کی جگہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ مزید یہ کہ مرض اور سفر کی حالت میں پانی موجود ہوتے ہوئے بھی آدمی تیمّم کر سکتا ہے۔

اِس سے بظاہر کوئی پاکیزگی تو حاصل نہیں ہوتی، لیکن اگر غور کیجیے تو اصل طریقۂ طہارت کی یادداشت ذہن میں قائم رکھنے کے پہلو سے اِس کی بڑی اہمیت ہے۔ شریعت میں یہ چیز بالعموم ملحوظ رکھی گئی ہے کہ جب اصلی صورت میں کسی حکم پر عمل کرنا ممکن نہ ہو یا بہت مشکل ہو جائے تو شبہی صورت میں اُس کی یادگار باقی رکھی جائے۔ اِس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ حالات معمول پر آتے ہی طبیعت اصلی صورت کی طرف پلٹنے کے لیے آمادہ ہو جاتی ہے۔

نماز کے اعمال

نماز کے لیے جو اعمال مقرر کیے گئے ہیں، وہ یہ ہیں:

نماز کی ابتدا رفع یدین سے، یعنی دونوں ہاتھ اوپر کی طرف اٹھا کر کی جائے،

قیام کیا جائے،

پھر رکوع کیا جائے،

پھر آدمی قومہ کے لیے کھڑا ہو،

پھر یکے بعد دیگرے دو سجدے کیے جائیں،

ہر نماز کی دوسری اور آخری رکعت میں نماز پڑھنے والا دو زانو ہو کر قعدے کے لیے بیٹھے،

نماز ختم کرنا پیش نظر ہو تو قعدے کی حالت میں منہ پھیر کر نماز ختم کر دی جائے۔

نماز کے اذکار

نماز کے اذکار درج ذیل ہیں:

نماز شروع کرتے ہوئے 'اَللّٰہُ اَکْبَرُ' کہا جائے،

قیام میں سورۂ فاتحہ کی تلاوت کی جائے، پھر اپنی سہولت کے مطابق باقی قرآن کے کچھ حصے کی تلاوت کی جائے،

رکوع میں جاتے ہوئے 'اَللّٰہُ اَکْبَرُ' کہا جائے،

رکوع سے اٹھتے ہوئے 'سَمِعَ اللّٰہُ لِمَنْ حَمِدَہٗ' کہا جائے،

سجدوں میں جاتے اور اُن سے اٹھتے ہوئے 'اَللّٰہُ اَکْبَرُ' کہا جائے،

قعدے سے قیام کے لیے اٹھتے ہوئے بھی 'اَللّٰہُ اَکْبَرُ' کہا جائے،

نماز ختم کرنے کے لیے 'اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ' کہا جائے۔

'اَللّٰہُ اَکْبَرُ' (اللہ سب سے بڑا ہے)، 'سَمِعَ اللّٰہُ لِمَنْ حَمِدَہٗ' (اللہ نے اُس کی بات سن لی جس نے اُس کی حمد کی) اور 'اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ' (تم پر سلامتی اور اللہ کی رحمت ہو) امام ہمیشہ بالجہر، یعنی بلند آواز سے کہے گا۔ مغرب اور عشا کی پہلی دو رکعتوں میں، اور فجر، جمعہ اور عیدین کی نمازوں میں قراءت بھی بلند آواز سے کی جائے گی۔ مغرب کی تیسری اور عشا کی تیسری اور چوتھی رکعت میں یہ ہمیشہ سری ہوگی۔ ظہر اور عصر کی نمازوں میں بھی

یہی طریقہ اختیار کیا جائے گا۔ اِن کی چاروں رکعتوں میں قراءت سری ہو گی۔

نماز کے لیے شریعت کے مقرر کردہ اذکار یہی ہیں اور اِن کی زبان عربی ہے، اِن کے علاوہ نماز پڑھنے والا جس زبان میں چاہے، تسبیح و تحمید اور دعا و مناجات کی نوعیت کا کوئی ذکر اپنی نماز میں کر سکتا ہے۔

نماز کے اوقات

نماز مسلمانوں پر شب و روز میں پانچ وقت فرض کی گئی ہے۔ یہ اوقات درج ذیل ہیں:

فجر، ظہر، عصر، مغرب اور عشا۔

صبح کی سفید دھاری سیاہ دھاری سے الگ ہو جائے تو یہ فجر ہے۔

ظہر سورج کے نصف النہار سے ڈھلنے کا وقت ہے۔

سورج مرأی العین سے نیچے آجائے تو یہ عصر ہے۔

سورج کے غروب ہو جانے کا وقت مغرب ہے۔

شفق کی سرخی ختم ہو جائے تو یہ عشا ہے۔

فجر کا وقت طلوع آفتاب تک، ظہر کا عصر، عصر کا مغرب، مغرب کا عشا اور عشا کا وقت آدھی رات تک ہے۔ سورج کے طلوع و غروب کے وقت چونکہ اُس کی عبادت کی جاتی تھی، اِس لیے یہ دونوں وقت نماز کے لیے ممنوع قرار دیے گئے ہیں۔ انبیا علیہم السلام کے دین میں نماز کے اوقات ہمیشہ یہی رہے ہیں۔

نماز کی رکعتیں

نماز کے لیے جو رکعتیں مقرر کی گئی ہیں، وہ یہ ہیں:

فجر: ۲ رکعت

ظہر: ۴ رکعت

عصر: ۴ رکعت

مغرب: ۳ رکعت

عشا: ۴ رکعت

نماز کی فرض رکعتیں یہی ہیں جن کے چھوڑنے پر قیامت میں مواخذہ ہوگا۔ چنانچہ اُن صورتوں کے سوا جن میں قصر کی اجازت دی گئی ہے، یہ لازماً پڑھی جائیں گی۔ اِن کے علاوہ باقی سب نمازیں نفل ہیں جن کا پڑھنا باعث اجر ہے، لیکن اُن کے چھوڑ دینے پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی مواخذے کا اندیشہ نہیں ہے۔

نماز میں رعایت

نماز کا وقت کسی خطرے، پریشانی، افراتفری اور آپا دھاپی کی حالت میں آجائے تو اللہ تعالیٰ نے اجازت دی ہے کہ پیدل چلتے ہوئے یا سواری پر، جس طرح ممکن ہو، نماز پڑھ لی جائے۔ اِس میں، ظاہر ہے کہ جماعت کا اہتمام نہیں ہوگا، قبلہ رو ہونے کی پابندی بھی برقرار نہ رہے گی اور نماز کے اعمال بھی بعض صورتوں میں اُن کے لیے مقرر کردہ طریقے پر ادا نہ ہو سکیں گے۔

اِس طرح کی صورت حال کسی سفر میں پیش آجائے تو قرآن نے مزید فرمایا ہے کہ لوگ نماز میں کمی بھی کر سکتے ہیں۔ اصطلاح میں اِسے قصر سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اِس کے لیے یہ سنت قائم کی ہے کہ صرف چار رکعت والی نمازیں دو رکعت پڑھی جائیں گی۔ دو اور تین رکعت والی نمازوں میں کوئی کمی نہ ہوگی۔ چنانچہ فجر اور مغرب کی نمازیں اِس طرح کے موقعوں پر بھی پوری پڑھیں گے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ فجر پہلے ہی دو رکعت ہے اور مغرب دن کے وتر ہیں، اِن کی یہ حیثیت تبدیل نہیں ہو سکتی۔

نماز میں تخفیف کی اِس اجازت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اِس کے اوقات میں تخفیف کا استنباط بھی کیا ہے اور اِس طرح کے سفروں میں ظہر و عصر، اور مغرب اور عشا کی نمازیں جمع کرکے پڑھائی ہیں۔

نماز کی جماعت

نماز اگرچہ تنہا بھی ادا کی جا سکتی ہے، لیکن بہتر یہی ہے کہ اِس کو جماعت کے ساتھ اور ممکن ہو تو کسی معبد میں جا کر ادا کیا جائے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اِسی مقصد سے یثرب پہنچ کر سب سے پہلے مسجد تعمیر کی اور مسلمانوں کی ہر بستی اور ہر محلے میں تعمیر مساجد کی روایت اِس کے ساتھ ہی قائم ہوگئی۔ اِن کی حاضری اور نماز باجماعت کا اہتمام بڑی فضیلت کی چیز ہے۔ عورتیں بے شک اِس سے مستثنیٰ ہیں، لیکن کسی مسلمان مرد کو بغیر کسی عذر کے اِس سے محروم نہیں رہنا چاہیے۔

قیام جماعت کا طریقہ درج ذیل ہے:

۱۔ نماز سے پہلے اذان دی جائے گی تا کہ لوگ اِسے سن کر جماعت میں شامل ہو سکیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اِس کے جو کلمات مقرر فرمائے ہیں، وہ یہ ہیں:

اَللّٰهُ اَكْبَرُ؛ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ؛ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدً رَّسُوْلُ اللّٰهِ؛ حَيَّ عَلَى الصَّلٰوةِ؛ حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ؛ اَللّٰهُ اَكْبَرُ؛ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ.

''اللہ سب سے بڑا ہے؛ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے؛ میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد اللہ کے رسول ہیں؛ نماز کی طرف آؤ؛ فلاح کی طرف آؤ؛ اللہ سب سے بڑا ہے؛ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے۔''

۲۔ ایک ہی مقتدی ہو تو وہ امام کے دائیں جانب اُس کے ساتھ کھڑا ہو گا اور زیادہ ہوں تو امام درمیان میں ہو گا اور وہ اُس کے پیچھے صف بنا کر کھڑے ہوں گے۔

۳۔ نماز کھڑی کرنے کے لیے اقامت کہی جائے گی۔ اُس میں اذان ہی کے الفاظ دہرائے جائیں گے۔ اتنا فرق، البتہ ہو گا کہ 'حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ' کے بعد اقامت کہنے والا 'قَدْ قَامَتِ الصَّلٰوةُ' (نماز کھڑی ہو گئی ہے) بھی کہے گا۔

۴۔ اذان کے کلمات پیشِ نظر مقصد کے لیے ایک سے زیادہ مرتبہ دہرائے جائیں گے۔

۵۔ اقامت کے کلمات بھی اگر ضرورت ہو تو اِسی طرح دہرائے جا سکتے ہیں۔

نماز میں غلطی

نماز کے لیے جو اعمال و اذکار مقرر کیے گئے ہیں، اُن میں کوئی غلطی ہو جائے یا شبہ ہو کہ غلطی ہوئی ہے تو یہ سنت قائم کی گئی ہے کہ غلطی کی تلافی کرنا ممکن ہو تو تلافی کے بعد اور ممکن نہ ہو تو اِس کے بغیر ہی نماز کے آخر میں دو سجدے زیادہ کر لیے جائیں۔

جمعہ کی نماز

جمعہ کے دن مسلمانوں پر لازم کیا گیا ہے کہ نماز ظہر کی جگہ وہ اِسی دن کے لیے خاص ایک اجتماعی نماز کا اہتمام کریں گے۔ اِس نماز کا طریقہ یہ ہے:

یہ نماز دو رکعت پڑھی جائے گی،

نماز ظہر کے برخلاف اِس کی دونوں رکعتوں میں قراءت جہری ہو گی،

نماز کے لیے تکبیر کہی جائے گی،

نماز سے پہلے امام حاضرین کی تذکیر و نصیحت کے لیے دو خطبے دے گا۔ یہ خطبے کھڑے ہو کر دیے جائیں گے۔ پہلے خطبے کے بعد اور دوسرا خطبہ شروع ہونے سے قبل امام چند لمحوں کے لیے بیٹھے گا،

نماز کی اذان اُس وقت دی جائے گی، جب امام خطبے کی جگہ پر آ جائے گا،

اذان ہوتے ہی تمام مسلمان مردوں کے لیے ضروری ہے کہ اُن کے پاس اگر کوئی عذر نہ ہو تو اپنی مصروفیات چھوڑ کر نماز کے لیے حاضر ہو جائیں،

نماز کا خطاب اور اُس کی امامت مسلمانوں کے ارباب حل و عقد کریں گے اور یہ صرف اُنھی مقامات پر ادا کی جائے گی جو اُن کی طرف سے اِس نماز کی جماعت کے لیے مقرر کیے جائیں گے اور جہاں وہ خود یا اُن کا کوئی نمائندہ اِس کی امامت کے لیے موجود ہو گا۔

عیدین کی نماز

عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے دن بھی مسلمانوں پر لازم ہے کہ طلوع آفتاب کے بعد اور زوال سے پہلے وہ جمعہ ہی کی طرح ایک اجتماعی نماز کا اہتمام کریں۔ اِس کا طریقہ درج ذیل ہے:

یہ نماز دو رکعت پڑھی جائے گی،

دونوں رکعتوں میں قراءت جہری ہو گی،

قیام کی حالت میں نمازی چند زائد تکبیریں کہیں گے،

نماز کے لیے نہ اذان ہو گی اور نہ تکبیر کہی جائے گی،

نماز کے بعد امام حاضرین کی تذکیر و نصیحت کے لیے دو خطبے دے گا۔ یہ خطبے کھڑے ہو کر دیے جائیں گے۔ پہلے خطبے کے بعد اور دوسرا خطبہ شروع کرنے سے قبل امام چند لمحوں کے لیے بیٹھے گا۔

اِس نماز کا خطاب اور اِس کی امامت بھی نماز جمعہ کی طرح مسلمانوں کے ارباب حل و عقد ہی کریں گے اور یہ اُنھی مقامات پر ادا کی جائے گی جو اُن کی طرف سے اِس نماز کی جماعت کے لیے مقرر کیے جائیں گے اور جہاں وہ

خود یا اُن کا کوئی نمائندہ اِس کی امامت کے لیے موجود ہوگا۔

جنازہ کی نماز

مرنے والوں کے لیے جنازہ کی نماز بھی انبیا علیہم السلام کے دین میں ضروری قرار دی گئی ہے۔

میت کو نہلانے اور اُس کی تجہیز و تکفین کے بعد یہ نماز جس طریقے سے ادا کی جائے گی، وہ یہ ہے:

میت کو اپنے اور قبلہ کے درمیان رکھ کر مقتدی امام کے پیچھے صف بنالیں گے،

رفع یدین کے ساتھ 'اَللّٰہُ اَکْبَرُ' کہہ کر نماز شروع کی جائے گی،

عیدین کی طرح اِس نماز میں بھی چند زائد تکبیریں کہی جائیں گی،

قیام کی حالت ہی میں تکبیرات اور دعاؤں کے بعد سلام پھیر کر نماز ختم کر دی جائے گی۔

نماز کی صورت میں کم سے کم یہی عبادت ہے جس کا مسلمانوں کو مکلّف ٹھیرایا گیا ہے۔تاہم قرآن کا ارشاد ہے کہ جس نے اپنے شوق سے نیکی کا کوئی کام کیا، اُسے اللہ قبول کرنے والا ہے۔ اِسی طرح فرمایا ہے کہ مصیبت کے موقعوں پر صبر اور نماز سے مدد چاہو۔ چنانچہ اِن ارشادات کے پیش نظر مسلمان اس لازمی نماز کے علاوہ بالعموم نوافل کا اہتمام بھی کرتے ہیں۔ اِس طرح کے جو نوافل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھے ہیں یا لوگوں کو پڑھنے کی ترغیب دی ہے، اُن کی تفصیلات روایتوں میں دیکھ لی جا سکتی ہیں۔

زکوٰۃ

نماز کے بعد یہ دوسری اہم ترین عبادت ہے۔ اپنے معبودوں کے لیے پرستش کے جو آداب انسان نے بالعموم اختیار کیے ہیں، اُن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اپنے مال، مواشی اور پیداوار میں سے ایک حصہ اُن کے حضور میں نذر کے طور پر پیش کیا جائے۔ اِسے صدقہ، نیاز، نذرانے اور بھینٹ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ انبیا علیہم السلام کے دین میں زکوٰۃ کی حیثیت اصلاً یہی ہے اور اِسی بنا پر اِسے عبادت قرار دیا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن نے کئی جگہ اِس کے لیے لفظ صدقہ استعمال کیا ہے اور وضاحت فرمائی ہے کہ اِسے دل کی خستگی اور فروتنی کے ساتھ ادا کیا جائے۔ اِس کے بارے میں عام روایت یہ رہی ہے کہ نذر گزارنے کے بعد اِسے معبد سے اٹھا کر اُس کے خدام کو دیا جاتا تھا کہ وہ اِس سے عبادت کے لیے آنے والوں کی خدمت کریں۔ اب یہ طریقہ باقی نہیں رہا۔ اِس کی جگہ مسلمانوں کو ہدایت کی گئی

ہے کہ نظم اجتماعی کی ضرورتوں کے لیے یہ مال ارباب حل وعقد کے سپرد کر دیا جائے۔ تاہم اِس کی حقیقت میں اِس سے کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ یہ خدا ہی کے لیے خاص ہے اور اُس کے بندے جب اِسے ادا کرتے ہیں تو اِس کی پذیرائی کا فیصلہ بھی اُسی بارگاہ سے ہوتا ہے۔

اِس کی تاریخ وہی ہے جو نماز کی ہے۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز کی طرح اِس کا حکم بھی انبیا علیہم السلام کی شریعت میں ہمیشہ موجود رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جب مسلمانوں کو اِس کے ادا کرنے کی ہدایت کی تو یہ اُن کے لیے کوئی اجنبی چیز نہ تھی۔ دین ابراہیمی کے تمام پیرو اِس کے احکام سے پوری طرح واقف تھے۔ چنانچہ یہ پہلے سے موجود ایک سنت تھی جسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا کے حکم سے اور ضروری اصلاحات کے بعد مسلمانوں میں جاری فرمایا ہے۔

اِس کا مقصد، اگر غور کیجیے تو اِس کے نام ہی سے متعین ہو جاتا ہے۔ اِس لفظ کی اصل نمو اور طہارت ہے۔ لہٰذا اِس سے مراد وہ مال ہے جو پاکیزگی اور طہارت حاصل کرنے کے لیے دیا جائے۔ اِس سے واضح ہے کہ زکوٰۃ کا مقصد وہی ہے جو پورے دین کا ہے۔ یہ نفس کو اُن آلایشوں سے پاک کرتی ہے جو مال کی محبت سے اُس پر آ سکتی ہیں، مال میں برکت پیدا کرتی ہے اور نفس انسانی کے لیے اُس کی پاکیزگی کو بڑھانے کا باعث بنتی ہے۔ اللہ کی راہ میں انفاق کا یہ کم سے کم مطالبہ ہے جسے ایک مسلمان کو ہر حال میں پورا کرنا ہے، اِس لیے اِس سے وہ سب کچھ تو حاصل نہیں ہوتا جو اِس سے آگے انفاق کے عام مطالبات کو پورا کرنے سے حاصل ہوتا ہے، تاہم انسان کا دل اِس سے بھی اپنے پروردگار سے لگ جاتا اور اللہ تعالیٰ سے وہ غفلت بڑی حد تک دور ہو جاتی ہے جو دنیا اور اسباب دنیا کے ساتھ تعلق خاطر کی وجہ سے اُس پر طاری ہوتی ہے۔

زکوٰۃ کا قانون

زکوٰۃ کا قانون درج ذیل ہے:

۱۔ پیداوار، تجارت اور کاروبار کے ذرائع، ذاتی استعمال کی چیزوں اور حد نصاب سے کم سرمایے کے سوا کوئی چیز بھی زکوٰۃ سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ یہ ہر مال، ہر قسم کے مواشی اور ہر نوعیت کی پیداوار پر عائد ہو گی اور ہر سال ریاست کے ہر مسلمان شہری سے لازماً وصول کی جائے گی۔

۲۔ اِس کی شرح یہ ہے:

مال میں ۲/۱ ۲ فی صدی سالانہ۔

پیداوار میں اگر وہ اصلاً محنت یا اصلاً سرمایے سے وجود میں آئے تو ہر پیداوار کے موقع پر اُس کا ۱۰ فی صدی، اور اگر محنت اور سرمایہ، دونوں کے تعامل سے وجود میں آئے تو ۵ فی صدی، اور دونوں کے بغیر محض عطیۂ خداوندی کے طور پر حاصل ہو جائے تو ۲۰ فی صدی۔

مواشی میں

ا۔اونٹ

۵ سے ۲۴ تک، ہر پانچ اونٹوں پر ایک بکری

۲۵ سے ۳۵ تک، ایک یک سالہ اونٹنی اور اگر وہ میسر نہ ہو تو دو سالہ اونٹ

۳۶ سے ۴۵ تک، ایک دو سالہ اونٹنی

۴۶ سے ۶۰ تک، ایک سہ سالہ اونٹنی

۶۱ سے ۷۵ تک، ایک چار سالہ اونٹنی

۷۶ سے ۹۰ تک، دو، دو سالہ اونٹنیاں

۹۱ سے ۱۲۰ تک، دو، سہ سالہ اونٹنیاں

۱۲۰ سے زائد کے لیے ہر ۴۰ پر ایک دو سالہ اور ہر ۵۰ پر ایک سہ سالہ اونٹنی۔

ب۔گائیں

ہر ۳۰ پر ایک یک سالہ اور ہر ۴۰ پر ایک دو سالہ بچھڑا۔

ج۔بکریاں

۴۰ سے ۱۲۰ تک، ایک بکری

۱۲۱ سے ۲۰۰ تک، دو بکریاں

۲۰۱ سے ۳۰۰ تک، تین بکریاں

۳۰۰ سے زائد میں ہر ۱۰۰ پر ایک بکری۔

۳۔زکوٰۃ کے جو مصارف قرآن میں بیان ہوئے ہیں، اُن کی تفصیل یہ ہے:

فقرا و مساکین کے لیے۔

ریاست کے تمام ملازمین کی خدمات کے معاوضے میں۔

اسلام اور مسلمانوں کے مفاد میں تمام سیاسی اخراجات کے لیے۔

ہر قسم کی غلامی سے نجات کے لیے۔

کسی نقصان، تاوان یا قرض کے بوجھ تلے دبے ہوئے لوگوں کی مدد کے لیے۔

دین کی خدمت اور لوگوں کی بہبود کے کاموں میں

مسافروں کی مدد اور اُن کے لیے سڑکوں، پلوں، سراؤں وغیرہ کی تعمیر کے لیے۔

۴۔ زکوٰۃ کی ایک قسم صدقۂ فطر بھی ہے۔ یہ ایک فرد کے لیے صبح و شام کا کھانا ہے جو چھوٹے بڑے ہر شخص کے لیے دینا لازم کیا گیا ہے اور رمضان کے اختتام پر نماز عید سے پہلے دیا جاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اِسے بالعموم اناج کی صورت میں ادا کیا جاتا تھا۔ چنانچہ آپ نے اِس کی مقدار ایک صاع، یعنی تقریباً ڈھائی کلوگرام مقرر کر دی تھی۔

روزہ

نماز اور زکوٰۃ کے بعد تیسری اہم عبادت روزہ ہے۔ عربی زبان میں اِس کے لیے 'صوم' کا لفظ آتا ہے جس کے معنی کسی چیز سے رک جانے اور اُس کو ترک کر دینے کے ہیں۔ شریعت کی اصطلاح میں یہ لفظ خاص حدود و قیود کے ساتھ کھانے پینے اور ازدواجی تعلقات سے رک جانے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اردو زبان میں اِسی کو روزہ کہتے ہیں۔ انسان چونکہ اِس دنیا میں اپنا ایک عملی وجود بھی رکھتا ہے، اِس لیے اللہ تعالیٰ کے لیے اُس کا جذبۂ عبادت جب اُس کے عملی وجود سے متعلق ہوتا ہے تو پرستش کے ساتھ اطاعت کو بھی شامل ہو جاتا ہے۔ روزہ اِسی اطاعت کا عملی اظہار ہے۔ اِس میں بندہ اپنے پروردگار کے حکم پر اور اُس کی رضا اور خوشنودی کی طلب میں بعض مباحات کو اپنے لیے حرام قرار دے کر مجسم اطاعت بن جاتا اور اِس طرح گویا زبان حال سے اِس بات کا اعلان کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اُس کے حکم سے بڑی کوئی چیز نہیں ہے۔ وہ اگر قانون فطرت کی رو سے جائز کسی شے کو بھی اُس کے لیے ممنوع ٹھیرا دیتا ہے تو بندے کی حیثیت سے زیبا یہی ہے کہ وہ بے چون و چرا اِس حکم کے سامنے سر تسلیم خم کر دے۔

اللہ کی عظمت و جلالت اور اُس کی بزرگی اور کبریائی کے احساس و اعتراف کی یہ حالت، اگر غور کیجیے تو اُس کی شکرگزاری کا حقیقی اظہار بھی ہے۔ چنانچہ قرآن نے اِسی بنا پر روزے کو خدا کی تکبیر اور شکرگزاری قرار دیا اور فرمایا ہے کہ اِس مقصد کے لیے رمضان کا مہینا اِس لیے خاص کیا گیا ہے کہ قرآن کی صورت میں اللہ نے جو ہدایت اِس مہینے میں

تمھیں عطا فرمائی ہے اور جس میں عقل کی رہنمائی اور حق و باطل میں فرق و امتیاز کے لیے واضح اور قطعی حجتیں ہیں، اُس پر اللہ کی بڑائی کرو اور اُس کے شکر گزار بنو۔ روزے کی یہی حقیقت ہے جس کے پیش نظر کہا گیا ہے کہ روزہ اللہ کے لیے ہے اور وہی اُس کی جزا دے گا۔ یعنی بندے نے جب بغیر کسی سبب کے محض اللہ کے حکم کی تعمیل میں بعض جائز چیزیں بھی اپنے لیے ممنوع قرار دے لی ہیں تو اب وہ ناپ تول کر اور کسی حساب سے نہیں، بلکہ خاص اپنے کرم اور اپنی عنایت سے اُس کا اجر دے گا اور اِس طرح بے حساب دے گا کہ وہ نہال ہو جائے گا۔

اِس کا منتہاے کمال یہ ہے کہ آدمی روزے کی حالت میں اپنے اوپر مزید کچھ پابندیاں عائد کر کے اور دوسروں سے الگ تھلگ ہو کر چند دنوں کے لیے مسجد میں بیٹھ جائے اور زیادہ سے زیادہ اللہ کی عبادت کرے۔ اصطلاح میں اِسے اعتکاف کہا جاتا ہے۔ یہ اگرچہ رمضان کے روزوں کی طرح لازم تو نہیں کیا گیا، لیکن تزکیۂ نفس کے نقطۂ نظر سے اِس کی بڑی اہمیت ہے۔ روزہ و نماز اور تلاوت قرآن کے امتزاج سے جو خاص کیفیت اِس سے پیدا ہوتی اور نفس پر تجرد و انقطاع اور تبتل الی اللہ کی جو حالت طاری ہو جاتی ہے، اُس سے روزے کا اصلی مقصود درجۂ کمال پر حاصل ہوتا ہے۔

نماز کی طرح روزے کی تاریخ بھی نہایت قدیم ہے۔ قرآن نے بتایا ہے کہ روزہ مسلمانوں پر اُسی طرح فرض کیا گیا، جس طرح وہ پہلی قوموں پر فرض کیا گیا تھا۔ چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ تربیت نفس کی ایک اہم عبادت کے طور پر اِس کا تصور تمام مذاہب میں رہا ہے۔

اس کا مقصد قرآن نے یہ بیان کیا ہے کہ لوگ خدا کا تقویٰ اختیار کر لیں۔ قرآن کی اصطلاح میں تقویٰ کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنے شب و روز کو اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ حدود کے اندر رکھ کر زندگی بسر کرے اور اپنے دل کی گہرائیوں میں اِس بات سے ڈرتا رہے کہ اُس نے اگر کبھی اِن حدود کو توڑا تو اِس کی پاداش سے اللہ کے سوا کوئی اُس کو بچانے والا نہیں ہو سکتا۔

روزے کا قانون

اِس کا قانون درج ذیل ہے:

روزے کی نیت سے اور محض اللہ کی خوشنودی کے لیے کھانے پینے اور بیویوں کے ساتھ تعلق سے اجتناب ہی روزہ ہے۔

یہ پابندی فجر سے لے کر رات کے شروع ہونے تک ہے، لہٰذا روزے کی راتوں میں کھانا پینا اور بیویوں کے پاس جانا بالکل جائز ہے۔

روزوں کے لیے رمضان کا مہینا خاص کیا گیا ہے، اِس لیے جو شخص اِس مہینے میں موجود ہو، اُس پر فرض ہے کہ اِس پورے مہینے کے روزے رکھے۔

بیماری یا سفر کی وجہ سے یا کسی اور مجبوری کے باعث آدمی اگر رمضان کے روزے پورے نہ کر سکے تو لازم ہے کہ دوسرے دنوں میں رکھ کر اُس کی تلافی کرے اور یہ تعداد پوری کر دے۔

حیض و نفاس کی حالت میں روزہ رکھنا ممنوع ہے۔ تاہم اِس طرح چھوڑے ہوئے روزے بھی بعد میں لازماً پورے کیے جائیں گے۔

روزے کا منتہاے کمال اعتکاف ہے۔ اللہ تعالیٰ اگر کسی شخص کو اِس کی توفیق دے تو اُسے چاہیے کہ روزوں کے مہینے میں جتنے دنوں کے لیے ممکن ہو، دنیا سے الگ ہو کر اللہ کی عبادت کے لیے مسجد میں گوشہ نشین ہو جائے اور بغیر کسی ناگزیر انسانی ضرورت کے مسجد سے باہر نہ نکلے۔

آدمی اعتکاف کے لیے بیٹھا ہو تو روزے کی راتوں میں کھانے پینے پر تو کوئی پابندی نہیں ہے، لیکن بیویوں کے پاس جانا اُس کے لیے جائز نہیں رہتا۔ اعتکاف کی حالت میں اللہ تعالیٰ نے اِسے ممنوع قرار دیا ہے۔

حج و عمرہ

یہ دونوں عبادات دین ابراہیمی میں عبادت کا منتہاے کمال ہیں۔ اِن کی تاریخ اُس منادی سے شروع ہوتی ہے جو ابراہیم علیہ السلام نے مسجد حرام کی تعمیر کے بعد کی تھی کہ لوگ خداوند کی نذر چڑھانے کے لیے آئیں اور توحید پر ایمان کا جو عہد اُنھوں نے باندھ رکھا ہے، اُسے یہاں آکر تازہ کریں۔

اپنے معبود کے لیے جذبۂ پرستش کا یہ آخری درجہ ہے کہ اُس کے طلب کرنے پر بندہ اپنا جان و مال، سب اُس کے حضور میں نذر کر دینے کے لیے حاضر ہو جائے۔ حج و عمرہ اِسی نذر کی تمثیل ہیں۔ یہ دونوں ایک ہی حقیقت کو ممثل کرتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ عمرہ اجمال ہے اور حج اِس لحاظ سے اُس کی تفصیل کر دیتا ہے کہ اِس سے وہ مقصد بھی بالکل نمایاں ہو کر سامنے آجاتا ہے جس کے لیے جان و مال نذر کر دینے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ آدم کی تخلیق سے اُس کی جو اسکیم دنیا میں بر پا ہوئی ہے، ابلیس نے پہلے دن ہی سے اُس کے خلاف اعلان جنگ کر رکھا ہے۔ چنانچہ اللہ کے بندے اب قیامت تک کے لیے اپنے اِس ازلی دشمن اور اِس کی ذریت کے خلاف برسر جنگ ہیں۔ یہی اِس دنیا کی آزمایش ہے جس میں کامیابی اور ناکامی پر انسان کے ابدی مستقبل کا انحصار ہے۔ اپنا جان و مال ہم اِسی جنگ کے لیے اللہ کی نذر کرتے ہیں۔ ابلیس کے خلاف اِس جنگ کو حج میں ممثل کیا گیا ہے۔ یہ تمثیل اس طرح ہے:

اللہ کے بندے اپنے پروردگار کی ندا پر دنیا کے مال و متاع اور اُس کی لذتوں اور مصروفیتوں سے ہاتھ اٹھاتے ہیں۔

پھر 'لَبَّیْکَ لَبَّیْکَ' کہتے ہوئے میدان جنگ میں پہنچتے اور بالکل مجاہدین کے طریقے پر ایک وادی میں ڈیرے ڈال دیتے ہیں۔

اگلے دن ایک کھلے میدان میں پہنچ کر اپنے گناہوں کی معافی مانگتے، اِس جنگ میں کامیابی کے لیے دعا و مناجات کرتے اور اپنے امام کا خطبہ سنتے ہیں۔

تمثیل کے تقاضے سے نمازیں قصر اور جمع کر کے پڑھتے اور راستے میں مختصر پڑاؤ کرتے ہوئے دوبارہ اپنے ڈیروں پر پہنچ جاتے ہیں۔

پھر شیطان پر سنگ باری کرتے، اپنے جانوروں کی قربانی پیش کر کے اپنے آپ کو خداوند کی نذر کرتے، سر منڈاتے اور نذر کے پھیروں کے لیے اصل معبد اور قربان گاہ میں حاضر ہو جاتے ہیں۔

پھر وہاں سے لوٹتے اور اگلے دو یا تین دن اِسی طرح شیطان پر سنگ باری کرتے رہتے ہیں۔

اس لحاظ سے دیکھیے تو حج و عمرہ میں احرام اِس بات کی علامت ہے کہ بندۂ مومن نے دنیا کی لذتوں، مصروفیتوں اور مرغوبات سے ہاتھ اٹھالیا ہے اور دو اَن سلی چادروں سے اپنا بدن ڈھانپ کر وہ برہنہ سر اور کسی حد تک برہنہ پا بالکل راہبوں کی صورت بنائے ہوئے اپنے پروردگار کے حضور میں پہنچنے کے لیے گھر سے نکل کھڑا ہوا ہے۔

تلبیہ اُس صدا کا جواب ہے جو سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے بیت الحرام کی تعمیر نو کے بعد اللہ تعالیٰ کے حکم سے ایک پتھر پر کھڑے ہو کر بلند کی تھی۔ اب یہ صدا دنیا کے گوشے گوشے تک پہنچ چکی ہے اور اللہ کے بندے اُس کی نعمتوں کا اعتراف اور اُس کی توحید کا اقرار کرتے ہوئے اِس صدا کے جواب میں 'لَبَّیْکَ، اَللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ' کا یہ دل نواز ترانہ پڑھتے ہیں۔

طواف نذر کے پھیرے ہیں۔ دین ابراہیمی میں یہ روایت قدیم سے چلی آ رہی ہے کہ جس کی قربانی کی جائے یا جس کو معبد کی خدمت کے لیے نذر کیا جائے، اُسے معبد یا قربان گاہ کے سامنے پھرایا جائے۔

حجر اسود کا استلام تجدید عہد کی علامت ہے۔ اِس میں بندہ اِس پتھر کو تمثیلاً اپنے پروردگار کا ہاتھ قرار دے کر اِس ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیتا اور عہد و میثاق کی قدیم روایت کے مطابق اِس کو چوم کر اپنے اِس عہد کی تجدید کرتا ہے کہ اسلام قبول کر کے وہ جنت کے عوض اپنا جان و مال، سب اللہ کے سپرد کر چکا ہے۔

سعی اسمٰعیل علیہ السلام کی قربان گاہ کا طواف ہے۔ سیدنا ابراہیم نے صفا کی پہاڑی پر کھڑے ہو کر اِس قربان گاہ کو دیکھا تھا اور پھر حکم کی تعمیل کے لیے ذرا تیزی کے ساتھ چلتے ہوئے مروہ کی طرف گئے تھے۔ چنانچہ صفا و مروہ کا یہ طواف بھی نذر کے پھیرے ہیں جو پہلے معبد کے سامنے اور اِس کے بعد قربانی کی جگہ پر لگائے جاتے ہیں۔

عرفات معبد کا قائم مقام ہے، جہاں شیطان کے خلاف اِس جنگ کے مجاہدین جمع ہوتے، اپنے گناہوں کی معافی مانگتے اور اِس جنگ میں کامیابی کے لیے دعا و مناجات کرتے ہیں۔

مزدلفہ راستے کا پڑاؤ ہے، جہاں وہ رات گزارتے اور صبح اُٹھ کر میدان میں اترنے سے پہلے ایک مرتبہ پھر دعا و مناجات کرتے ہیں۔

رمی ابلیس پر لعنت اور اُس کے خلاف جنگ کی علامت ہے۔ یہ عمل اِس عزم کے ساتھ کیا جاتا ہے کہ بندۂ مومن ابلیس کی پسپائی سے کم کسی چیز پر راضی نہ ہو گا۔ یہ معلوم ہے کہ انسان کا یہ ازلی دشمن جب وسوسہ انگیزی کرتا ہے تو اِس کے بعد خاموش نہیں ہو جاتا، بلکہ یہ سلسلہ جاری رکھتا ہے۔ تاہم مزاحمت کی جائے تو اِس کی تاخت بتدریج کمزور ہو جاتی ہے۔ تین دن کی رمی اور اِس کے لیے پہلے بڑے اور اِس کے بعد چھوٹے جمرات کی رمی سے اِسی بات کو ظاہر کیا گیا ہے۔

قربانی جان کا فدیہ ہے اور سر کے بال مونڈنا اِس بات کی علامت ہے کہ نذر پیش کر دی گئی اور اب بندہ اپنے خداوند کی اطاعت اور دائمی غلامی کی اِس علامت کے ساتھ اپنے گھر لوٹ سکتا ہے۔

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ کس قدر غیر معمولی عبادت ہے جو ہر صاحب استطاعت مسلمان پر زندگی میں کم سے کم ایک مرتبہ فرض کی گئی ہے۔ اس کا مقصد وہی ہے جو اِس کی حقیقت ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا اعتراف، اُس کی توحید کا اقرار اور اِس بات کی یاد دہانی کہ اسلام قبول کر کے ہم اپنے آپ کو پروردگار کی نذر کر چکے ہیں۔ یہی وہ چیزیں ہیں جن کی معرفت اور دل و دماغ میں جن کے رسوخ کو قرآن نے مقامات حج کے منافع سے تعبیر کیا ہے۔ یہ

مقصد ذکر کے اُن الفاظ سے نہایت خوبی کے ساتھ واضح ہوتا ہے جو اِس عبادت کے لیے مقرر کیے گئے ہیں۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ اِسی مقصد کو نمایاں رکھنے اور ذہنوں میں پوری طرح راسخ کر دینے کے لیے منتخب کیے گئے ہیں۔ چنانچہ احرام باندھ لینے کے بعد یہ الفاظ ہر شخص کی زبان پر مسلسل جاری رہتے ہیں:

لَبَّیْكَ، اَللّٰھُمَّ لَبَّیْكَ؛ لَبَّیْكَ لَا شَرِیكَ لَكَ، لَبَّیْكَ؛ اِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَكَ وَالْمُلْكَ؛ لَا شَرِیكَ لَكَ.

''میں حاضر ہوں، اے اللہ، میں حاضر ہوں؛ حاضر ہوں، تیرا کوئی شریک نہیں؛ میں حاضر ہوں، حمد تیرے لیے ہے، سب نعمتیں تیری ہیں اور بادشاہی بھی تیرے ہی لیے ہے؛ تیرا کوئی شریک نہیں۔''

حج وعمرہ کا طریقہ

حج وعمرہ* کے لیے جو طریقہ مقرر کیا گیا ہے، وہ یہ ہے:

عمرہ

اِس عبادت کی نیت سے اِس کا احرام باندھا جائے۔

باہر سے آنے والے یہ احرام اپنی میقات سے باندھیں؛ مقیم خواہ وہ مکی ہوں یا عارضی طور پر مکہ میں ٹھیرے ہوئے ہوں، اِسے حدود حرم سے باہر کسی جگہ سے باندھیں؛ اور جو لوگ اِن حدود سے باہر، لیکن میقات کے اندر رہتے ہوں، اُن کی میقات وہی جگہ ہے، جہاں وہ مقیم ہیں، وہ وہیں سے احرام باندھ لیں اور تلبیہ پڑھنا شروع کر دیں۔

بیت اللہ میں پہنچنے تک تلبیہ کا ورد جاری رکھا جائے۔

وہاں پہنچ کر بیت اللہ کا طواف کیا جائے۔

پھر صفا ومروہ** کی سعی کی جائے۔

ہدی کے جانور ساتھ ہوں تو اُن کی قربانی کی جائے۔

---

* عمرہ کے لیے کوئی وقت مقرر نہیں ہے۔ یہ پورے سال میں لوگ جب چاہیں، کر سکتے ہیں۔ حج کے لیے، البتہ ۸/ ذوالحجہ سے ۱۳/ ذوالحجہ تک کے ایام مقرر ہیں اور یہ اِنھی ایام میں ہو سکتا ہے۔

** یہ دو پہاڑیاں ہیں جو بیت اللہ کے بالکل قریب واقع ہیں۔ سیدنا اسمٰعیل کی قربانی کا واقعہ اِنھی میں سے ایک پہاڑی مروہ پر پیش آیا تھا۔

قربانی کے بعد مرد سر منڈوا کر یا حجامت کرا کے اور عورتیں اپنی چوٹی کے آخر سے تھوڑے سے بال کاٹ کر احرام کھول دیں۔

یہ احرام ایک اصطلاح ہے۔ اِس کے معنی یہ ہیں کہ اب وہ شہوت کی کوئی بات نہیں کریں گے؛ زیب و زینت کی کوئی چیز، مثلاً خوشبو وغیرہ استعمال نہیں کریں گے؛ ناخن نہیں تراشیں گے، نہ جسم کے کسی حصے کے بال اتاریں گے، نہ میل کچیل دور کریں گے، یہاں تک کہ اپنے بدن کی جوئیں بھی نہیں ماریں گے؛ شکار نہیں کریں گے؛ سلے ہوئے کپڑے نہیں پہنیں گے؛ اپنا سر، چہرہ اور پاؤں کے اوپر کا حصہ کھلا رکھیں گے، اور ایک چادر تہ بند کے طور پر باندھیں گے اور ایک اوڑھ لیں گے۔

عورتیں، البتہ سلے ہوئے کپڑے پہنیں گی اور سر اور پاؤں بھی ڈھانپ سکیں گی۔ اُن کے لیے صرف چہرہ اور ہاتھ کھلے رکھنے ضروری ہیں۔

میقات اُن جگہوں کو کہتے ہیں جو حج و عمرہ کی غرض سے آنے والوں کے لیے حدود حرم سے کچھ فاصلے پر متعین کر دی گئی ہیں۔ اِن سے آگے وہ احرام کے بغیر نہیں جا سکتے۔ یہ جگہیں پانچ ہیں: مدینہ سے آنے والوں کے لیے ذوالحلیفہ، یمن سے آنے والوں کے لیے یلملم، مصر و شام سے آنے والوں کے لیے جحفہ، نجد سے آنے والوں کے لیے قرن اور مشرق کی طرف سے آنے والوں کے لیے ذات عرق۔

تلبیہ سے مراد 'لَبَّیْكَ، اَللّٰھُمَّ لَبَّیْكَ؛ لَبَّیْكَ لَا شَرِیْكَ لَكَ، لَبَّیْكَ؛ اِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَكَ وَالْمُلْكَ؛ لَا شَرِیْكَ لَكَ' کا ورد ہے جو احرام باندھتے ہی شروع ہوتا اور بیت اللہ میں پہنچنے تک برابر جاری رہتا ہے۔ حج و عمرہ کے لیے تنہا یہی ذکر ہے جو اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمایا ہے۔

طواف کا لفظ اُن سات پھیروں کے لیے بولا جاتا ہے جو ہر طرح کی نجاست سے پاک ہو کر بیت اللہ کے گرد لگائے جاتے ہیں۔ اِن میں سے ہر پھیرا حجر اسوٗد* سے شروع ہو کر اُسی پر ختم ہوتا ہے اور ہر پھیرے کی ابتدا میں حجر اسود کا استلام کیا جاتا ہے۔ یہ حجر اسود کو چومنے یا ہاتھ سے اُس کو چھو کر اپنا ہاتھ چوم لینے کے لیے ایک اصطلاح ہے۔ ہجوم کی صورت میں ہاتھ سے یا ہاتھ کی چھڑی سے یا اِس طرح کی کسی دوسری چیز سے اشارہ کر دینا بھی اِس کے لیے کافی سمجھا جاتا ہے۔

سعی سے مراد صفا و مروہ کا طواف ہے۔ یہ بھی سات پھیرے ہیں جو صفا سے شروع ہوتے ہیں۔ صفا سے مروہ

---

* یہ بیت اللہ کی پرانی تعمیر کا پتھر ہے جسے تجدید عہد کی علامت کے طور پر اُس کے ایک گوشے میں نصب کیا گیا ہے۔

تک ایک اور مروہ سے صفا تک دوسرا پھیرا شمار کیا جاتا ہے۔ اِن میں سے آخری پھیرا مروہ پر ختم ہوتا ہے۔

قربانی کی طرح صفا و مروہ کی یہ سعی بھی بطور تطوع کی جاتی ہے۔ یہ عمرے کا کوئی لازمی حصہ نہیں ہے۔ عمرہ اِس کے بغیر بھی مکمل ہو جاتا ہے۔

ہدی کا لفظ اُن جانوروں کے لیے بولا جاتا ہے جو حرم میں قربانی کے لیے خاص کیے گئے ہوں۔ دوسرے جانوروں سے اُن کو ممیّز رکھنے کے لیے اُن کے جسم پر نشان لگائے جاتے اور گلے میں پٹے ڈالے جاتے ہیں۔

حج

عمرے کی طرح حج کے لیے بھی پہلا کام یہی ہے کہ اِس کی نیت سے اِس کا احرام باندھا جائے،

باہر سے آنے والے یہ احرام اپنی میقات سے باندھیں؛ مقیم خواہ وہ مکی ہوں یا عارضی طور پر مکہ میں ٹھیرے ہوئے ہوں یا حدودِ حرم سے باہر، لیکن میقات کے اندر رہتے ہوں، اُن کی میقات وہی جگہ ہے، جہاں وہ مقیم ہیں، وہ وہیں سے احرام باندھ لیں اور تلبیہ پڑھنا شروع کر دیں۔

۸/ ذوالحجہ کو منیٰ کے لیے روانہ ہوں اور وہاں قیام کریں۔

۹/ ذوالحجہ کی صبح عرفات کے لیے روانہ ہوں۔

وہاں پہنچ کر امام ظہر کی نماز سے پہلے حج کا خطبہ دے، پھر ظہر اور عصر کی نماز جمع اور قصر کر کے پڑھی جائے۔

نماز سے فارغ ہو کر جتنی دیر کے لیے ممکن ہو، اللہ تعالیٰ کے حضور میں تسبیح و تحمید، تکبیر و تہلیل اور دعا و مناجات کی جائے۔

غروب آفتاب کے بعد مزدلفہ کے لیے روانہ ہوں۔

وہاں پہنچ کر مغرب اور عشا کی نماز جمع اور قصر کر کے پڑھی جائے۔

رات کو اِسی میدان میں قیام کیا جائے۔

فجر کے بعد یہاں بھی تھوڑی دیر کے لیے عرفات ہی کی طرح تسبیح و تحمید، تکبیر و تہلیل اور دعا و مناجات کی جائے۔

پھر منیٰ کے لیے روانہ ہوں اور وہاں جمرۂ عقبہ کے پاس پہنچ کر تلبیہ پڑھنا بند کر دیا جائے اور اِس جمرے کو سات کنکریاں ماری جائیں۔

ہدی کے جانور ساتھ ہوں یا نذر اور کفارے کی کوئی قربانی واجب ہو چکی ہو تو یہ قربانی کی جائے۔

پھر مرد سر منڈوا کر یا حجامت کرا کے اور عورتیں اپنی چوٹی کے آخر سے تھوڑے سے بال کاٹ کر احرام کا لباس اتار دیں،

پھر بیت اللہ پہنچ کر اُس کا طواف کیا جائے۔

احرام کی تمام پابندیاں اِس کے ساتھ ہی ختم ہو جائیں گی، اِس کے بعد اگر شوق ہو تو بطور تطوع صفا و مروہ کی سعی بھی کی جائے۔

پھر منیٰ واپس پہنچ کر دو یا تین دن قیام کیا جائے اور روزانہ پہلے جمرۃ الاولیٰ، پھر جمرۃ الوسطیٰ اور اِس کے بعد جمرۃ الاخریٰ کو سات سات کنکریاں ماری جائیں۔

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے زمانے سے حج و عمرہ کے مناسک یہی ہیں۔قرآن نے اِن میں کوئی تبدیلی نہیں کی، صرف اتنا کیا ہے کہ اِن سے متعلق بعض فقہی مسائل کی توضیح فرمادی ہے۔

یہ احکام درج ذیل ہیں:

پہلا حکم یہ ہے کہ حج و عمرہ کے تعلق سے جو حرمتیں اللہ تعالیٰ نے قائم کر دی ہیں، اُن کی تعظیم ایمان کا تقاضا ہے، وہ ہر حال میں قائم رہنی چاہییں۔تاہم کوئی دوسرا فریق اگر اُنھیں ملحوظ رکھنے سے انکار کر دیتا ہے تو اِس کے بدلے میں مسلمانوں کو بھی حق ہے کہ وہ برابر کا اقدام کریں، اِس لیے کہ اِس طرح کی حرمتیں باہمی طور پر ہی قائم رہ سکتی ہیں، اُنھیں کوئی فریق اپنے طور پر قائم نہیں رکھ سکتا۔

دوسرا حکم یہ ہے کہ اِس اجازت کے باوجود مسلمان اپنی طرف سے کوئی پیش قدمی نہیں کر سکتے۔یہ اللہ کی حرمتیں ہیں، اِن کے توڑنے میں پہل ایک بدترین جرم ہے۔اِس کا ارتکاب کسی حال میں بھی نہیں ہونا چاہیے۔

تیسرا حکم یہ ہے کہ حالت احرام میں شکار کی ممانعت صرف خشکی کے جانوروں کے لیے ہے، دریائی جانوروں کا شکار کرنا یا دوسروں کا کیا ہوا شکار کھالینا، دونوں جائز ہیں۔تاہم اِس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ لوگ اِس رخصت سے آگے بڑھنے کی کوشش کریں۔خشکی کا شکار ہر حال میں ممنوع ہے۔لہٰذا اگر کوئی شخص جانتے بوجھتے اِس گناہ کا ارتکاب کر بیٹھتا ہے تو اُسے کفارہ ادا کرنا چاہیے۔

اِس کی تین صورتیں ہیں:

جس طرح کا جانور شکار کیا گیا ہے، اُسی قبیل کا کوئی جانور گھریلو چوپایوں میں سے قربانی کے لیے بیت اللہ بھیجا جائے۔

اگر یہ ممکن نہ ہو تو اُس جانور کی قیمت کی نسبت سے مسکینوں کو کھانا کھلایا جائے۔

یہ بھی دشوار ہو تو اتنے روزے رکھے جائیں، جتنے مسکینوں کو کھانا کھلانا کسی شخص پر عائد ہوتا ہے۔

رہی یہ بات کہ جانوروں کا بدل کیا ہے یا اگر جانور کی قربانی متعذر ہے تو اُس کی قیمت کیا ہوگی یا اُس کے بدلے میں کتنے مسکینوں کو کھانا کھلایا جائے یا کتنے روزے رکھے جائیں گے تو اِس کا فیصلہ مسلمانوں میں سے دو ثقہ آدمی کریں گے تاکہ جرم کا ارتکاب کرنے والوں کے لیے اپنے نفس کی جانب داری کا کوئی امکان باقی نہ رہے۔

چوتھا حکم یہ ہے کہ حج و عمرہ کے لیے سفر کرنے والے اگر کسی جگہ گھر جائیں اور اُن کے لیے آگے جانا ممکن نہ رہے تو اونٹ، گائے، بکری میں سے جو میسر ہو، اُسے قربانی کے لیے بھیج دیں یا بھیجنا ممکن نہ ہو تو اُسی جگہ قربانی کر دیں اور سر منڈوا کر احرام کھول دیں۔ اُن کا حج و عمرہ یہی ہے۔ اس معاملے میں یہ بات، البتہ واضح رہنی چاہیے کہ قربانی اِس طرح کی کسی جگہ پر کی جائے یا مکہ اور منیٰ میں، اُس سے پہلے سر منڈوانا جائز نہیں ہے، الّا یہ کہ کوئی شخص بیمار ہو یا اُس کے سر میں کوئی تکلیف ہو اور وہ قربانی سے پہلے ہی سر منڈوانے پر مجبور ہو جائے۔ قرآن نے اجازت دی ہے کہ اِس طرح کی کوئی مجبوری پیش آجائے تو لوگ سر منڈوا لیں، لیکن روزوں یا صدقے یا قربانی کی صورت میں اُس کا فدیہ دیں اور اُن کی تعداد اور مقدار اپنی صواب دید سے جو مناسب سمجھیں طے کر لیں۔

پانچواں حکم یہ ہے کہ باہر سے آنے والے اگر ایک ہی سفر میں حج و عمرہ، دونوں کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں۔ اِس کا طریقہ یہ ہے کہ وہ پہلے عمرہ کر کے احرام کھول دیں، پھر ۸/ ذوالحجہ کو مکہ ہی میں دوبارہ احرام باندھ کر حج کر لیں۔ یہ محض ایک رخصت ہے جو اللہ تعالیٰ نے دو مرتبہ سفر کی زحمت پیش آجانے کے پیش نظر باہر سے آنے والے عازمین حج کو عطا فرمائی ہے۔ لہٰذا وہ اِس کا فدیہ دیں گے۔ اِس کی دو صورتیں ہیں:

اونٹ، گائے اور بکری میں سے جو جانور بھی میسر ہو، اُس کی قربانی کی جائے۔

یہ ممکن نہ ہو تو دس روزے رکھے جائیں: تین حج کے دنوں میں اور سات حج سے واپسی کے بعد۔

اس سے واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہتر یہی ہے کہ حج کے لیے الگ اور عمرے کے لیے الگ سفر کیا جائے۔ چنانچہ قرآن نے صراحت کر دی ہے کہ یہ رعایت اُن لوگوں کے لیے نہیں ہے جن کے گھر در مسجد حرام کے پاس ہوں۔

چھٹا حکم یہ ہے کہ منیٰ سے ۱۲/ ذوالحجہ کو بھی واپس آسکتے ہیں اور چاہیں تو ۱۳/ ذوالحجہ تک بھی ٹھیر سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ دونوں ہی صورتوں میں کوئی گناہ نہیں ہے۔ اِس لیے کہ اصل اہمیت اِس کی نہیں کہ لوگ کتنے دن ٹھیرے، بلکہ اِس کی ہے کہ جتنے دن بھی ٹھیرے، خدا کی یاد میں اور اُس سے ڈرتے ہوئے ٹھیرے۔

قربانی

دنیا کے تمام مذاہب میں قربانی اللہ تعالیٰ کے تقرب کا ایک بڑا ذریعہ رہی ہے۔ اِس کی حقیقت وہی ہے جو زکوٰۃ کی ہے، لیکن یہ اصلاً مال کی نہیں، بلکہ جان کی نذر ہے جو اُس جانور کے بدلے میں چھڑا لی جاتی ہے جسے ہم اِس کا قائم مقام بنا کر قربان کرتے ہیں۔

اِس کی تاریخ آدم علیہ السلام سے شروع ہوتی ہے۔ قرآن میں بیان ہوا ہے کہ اُن کے دو بیٹوں، (ہابیل اور قابیل) نے اپنی اپنی نذر اللہ تعالیٰ کے حضور میں پیش کی تو ایک کی نذر قبول کر لی گئی اور دوسرے کی قبول نہیں ہوئی۔ بائیبل میں صراحت ہے کہ ہابیل نے اِس موقع پر اپنی بھیڑ بکریوں کے کچھ پہلوٹے بچوں کی قربانی پیش کی تھی۔

یہ طریقہ بعد میں بھی، ظاہر ہے کہ قائم رہا ہوگا۔ چنانچہ اِس کے آثار ہم کو تمام مذاہب میں ملتے ہیں۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی قربانی کے بعد، البتہ جو اہمیت و عظمت اور وسعت و ہمہ گیری اِس عبادت کو حاصل ہوئی ہے، وہ اِس سے پہلے، یقیناً حاصل نہیں تھی۔ اُنھیں جب یہ ہدایت کی گئی کہ وہ بیٹے کی جگہ جانور کی قربانی دیں تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے اسمٰعیل کو ایک ذبح عظیم کے عوض چھڑا لیا ہے۔ اِس کے معنی یہ تھے کہ ابراہیم کی یہ نذر قبول کر لی گئی ہے اور اب نسلاً بعد نسلٍ لوگ اپنی قربانیوں کے ذریعے سے اِس واقعے کی یاد قائم رکھیں گے۔ حج و عمرہ کے موقع پر اور عید الاضحیٰ کے دن یہی قربانی ہے جو ہم ایک نفل عبادت کے طور پر پورے اہتمام کے ساتھ کرتے ہیں۔

اس کا مقصد اللہ تعالیٰ کی شکر گزاری ہے۔ ہم اپنی جان کا نذرانہ قربانی کے جانوروں کو اُس کی علامت بنا کر بارگاہ خداوندی میں پیش کرتے ہیں تو گویا اسلام و اخبات کی اُس ہدایت پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں جس کا اظہار سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اپنے اکلوتے فرزند کی قربانی سے کیا تھا۔ اِس موقع پر تکبیر و تہلیل کے الفاظ اِسی مقصد سے ادا کیے جاتے ہیں۔

یہ، اگر غور کیجیے تو پرستش کا منتہاے کمال ہے۔ اپنا اور اپنے جانور کا منہ قبلہ کی طرف کر کے اور 'بِسْمِ اللّٰہِ، وَاللّٰہُ اَکْبَرُ' کہہ کر ہم اپنے جانوروں کو قیام یا سجدے کی حالت میں اِس احساس کے ساتھ اپنے پروردگار کی نذر کر دیتے ہیں کہ یہ درحقیقت ہم اپنے آپ کو اُس کی نذر کر رہے ہیں۔

قربانی کا قانون

اس کا قانون یہ ہے:

قربانی انعام کی قسم کے تمام چوپایوں کی ہوسکتی ہے۔

اِس کا جانور بے عیب اور اچھی عمر کا ہونا چاہیے۔

قربانی کا وقت یوم النحر ۱۰ ر ذوالحجہ کو عید الاضحیٰ کی نماز سے فراغت کے بعد شروع ہوتا ہے۔

اس کے ایام وہی ہیں جو مزدلفہ سے واپسی کے بعد منیٰ میں قیام کے لیے مقرر کیے گئے ہیں۔ اصطلاح میں اِنھیں ایام تشریق کہا جاتا ہے۔قربانی کے علاوہ اِن ایام میں یہ سنت بھی قائم کی گئی ہے کہ ہر نماز کی جماعت کے بعد تکبیریں کہی جائیں۔نمازوں کے بعد تکبیر کا یہ حکم مطلق ہے۔اِس کے کوئی خاص الفاظ شریعت میں مقرر نہیں کیے گئے۔

قربانی کا گوشت لوگ خود بھی بغیر کسی تردد کے کھا سکتے اور دوسروں کو بھی کھلا سکتے ہیں۔

طالب محسن

متفرق سوالات

[المورد میں خطوط اور ای میل کے ذریعے سے دینی موضوعات پر سوالات موصول ہوتے ہیں۔ جناب جاوید احمد غامدی کے تلامذہ ان سوالوں کے جواب دیتے ہیں۔ یہاں ان میں سے منتخب سوال و جواب کو افادۂ عام کے لیے شائع کیا جا رہا ہے۔]

قرآن مجید میں گرامر اور املا کی غلطی کا دعویٰ

سوال: ڈاکٹر طٰہٰ حسین (وزیر تعلیم مصر) کی کتابوں میں ذکر ملتا ہے کہ قرآن مجید میں املا اور گرامر کی غلطیاں ہیں۔ کچھ اور محققین نے بھی اس طرح کے دعوے کیے ہیں۔ اس ہرزہ سرائی کی کیا حقیقت ہے؟
(محمد عارف جان)

جواب: املا اور گرامر دو الگ الگ موضوعات ہیں۔ املا میں صحابہ کے بعد بہت سی تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ یہ تبدیلیاں ظاہر ہے تلفظ اور مادے کی رعایت سے کی گئی ہیں۔ قرآن مجید میں بعض جگہ پر صحابہ رضوان اللہ علیہم کی املا ان تبدیلیوں کے مطابق نہیں ہے، لیکن قرآن مجید میں ان کے حوالے سے تبدیلی نہیں کی گئی تاکہ قرآن مجید کی صحابہ رضوان اللہ علیہم کے ساتھ نسبت پوری طرح قائم رہے۔

باقی رہا گرامر کا معاملہ تو اس میں طٰہٰ حسین اور اس کے ہمنواؤں کی بات بالکلیہ غلط ہے۔ گرامر کے قواعد اہل زبان کے تعامل کو سامنے رکھ کر متعین کیے جاتے ہیں۔ ان کی صحت و عدم صحت اہل زبان کے عمل کی کسوٹی پر پرکھ کر طے کی جاتی ہے، ان کی روشنی میں اہل زبان کو غلط قرار نہیں دیا جاتا۔ قرآن مجید میں کوئی ایک جملہ بھی ایسا نہیں ہے جو عربوں

کے معروف اسالیب اور تراکیب کے مطابق نہ ہو۔ زمخشری، سیبویہ اور ابن ہشام جیسے نحوی اپنے قواعد کے لیے سب سے محکم شاہد قرآن مجید کے جملوں کو قرار دیتے ہیں اور اعتماد کے ساتھ قرآن مجید سے مثالیں نقل کرتے ہیں۔ یہ اہل فن کے ہاں مسلم ہے کہ گرامر کی کوئی کتاب زبان کے تمام امکانات کا احاطہ نہیں کرتی۔ چنانچہ نئے ماہرین اس کمی کی تلافی کا کام جاری رکھتے ہیں۔ اگر کسی کو قرآن مجید کا کوئی جملہ اپنی مزعومہ گرامر کے مطابق نظر نہیں آتا تو اسے چاہیے کہ اسے اپنے علم کی کمی سمجھے۔ یہاں میں یہ بھی عرض کر دوں کہ آج تک نحوی غلطیوں کی جو مثالیں بھی پیش کی گئی ہیں ان کا تجزیہ کر کے بتا دیا گیا ہے کہ یہ دعویٰ درست نہیں ہے۔

قلب کی حقیقت

سوال: مجھے یہ سمجھنے میں مشکل پیش آ رہی ہے کہ 'قلب' کیا ہے۔ میں اپنا اشکال تفصیل سے بیان کر رہا ہوں۔ آپ سے درخواست ہے کہ اس کا مطالعہ کر کے میرا یہ مسئلہ حل کر دیں۔ سورۂ بقرہ کی آیت ۱۰ میں ہے: ''ان کے دلوں میں بیماری ہے اور اللہ نے ان کی بیماری بڑھا دی۔''

ہم نے لفظ 'قلب' کا ترجمہ دل کیا ہے۔ یہ لفظ قرآن مجید میں کئی مرتبہ آیا ہے۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے پرانے فلسفی اور مذہبی کتابیں بھی دل کا ذکر مرکز احساسات کے طور پر کرتے ہیں، لیکن جدید نفسیات کے مطابق یہ بات بالکلیہ غلط ہے:

''قدیم فلسفی اور مقبول عام تصور دل کو جذبات کا محل قرار دیتا ہے۔ اس کے برعکس جدید سائنسی تحقیقات سے ظاہر ہوتا ہے کہ دماغ ہی محرکات، داعیات اور جذبات کی آماج گاہ ہے۔'' (Psychology for VCE, Valerie Clarke & Susan Gillet, Chapter3, Page 48)

محبت جیسی چیز کو بھی اب دماغ کے ایک حصے میں خون کے بہاؤ کی پیمایش سے متعین کر لیا گیا ہے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: ''The Science of Love, Charles Pasternak''۔

اب بتائیے کہ قرآن کے قلب کی تعریف (Defination) کیسے کی جائے گی۔ اگر ہم صوفیہ کے اس قول کو مان لیتے ہیں کہ قلب انسانی روح کا ایک لطیف جز ہے جس کے ساتھ انسان کے بہت سے خصائص وابستہ ہیں تو اس چیز کو بھی جدید نفسیات غلط قرار دیتی ہے:

’’سترویں صدی عیسوی میں فرانسیسی فلسفی رینے ڈیکارٹ نے دہرے پن کا تصور پیش کیا، یعنی ذہن (یا روح) اور جسم الگ الگ چیزیں ہیں۔

ذہن اور جسم کا الگ الگ آزاد وجود انھی فلسفیوں کو معقول دکھائی دیتا ہے جنھیں انسانی جسم کی پیچیدگیوں کا کچھ بھی اندازہ نہیں تھا۔ انیسویں صدی عیسوی کے دوران میں ہم نے دماغ کی کارکردگی کو بہتر طور پر سمجھنا شروع کر دیا تھا۔ اس کا آغاز غالباً ۱۸۶۰ء میں بروکا (Broca) کی دریافت سے ہوا تھا، یعنی دماغ کا وہ حصہ جس میں گفتگو وجود پاتی ہے۔ انیسویں اور بیسویں صدی کی سائنسی دریافتیں دہرے پن کے تصور کو رد کر کے وحدت کا تصور پیش کرتی ہیں۔ مراد یہ ہے کہ کوئی شے اس وقت تک ذہنی نہیں ہوتی جب تک وہ جسمانی نہ ہو۔‘‘ (Psychology for VCE, Valerie Clarke & Susan Gillet, Chapter3, Pa) (جنید حسین)

جواب: آپ کے سوال کا ایک جواب یہ ہے کہ قرآن مجید میں لفظ قلب کا استعمال محاورے کے طور پر ہوا ہے۔ اہل عرب کچھ افعال کو قلب سے منسوب کرتے تھے۔ قرآن مجید نے اس تصور کی تردید کی کوئی ضرورت نہیں سمجھی اور انسانی شخصیت کے کچھ خصائص کے لیے وہی الفاظ اور اسالیب استعمال کیے ہیں جو عرب کرتے تھے۔ گویا قرآن دماغ اور قلب کی دوئی کا قائل نہیں ہے۔ قرآن کے پیش نظر چونکہ صرف ہدایت ہے، اسے عربوں کی نفسیات، فلکیات، بائیالوجی اور حیوانیات وغیرہ میں اصلاح سے کوئی غرض نہیں تھی، اس لیے اس نے انسانی شخصیت کی ایک جہت یا انسانی دماغ کے ایک وظیفے کے لیے جو اپنی جگہ پر ایک حقیقت ہے، مروج لفظ قلب کو اپنے مدعا کے اظہار کے لیے استعمال کیا تاکہ اس کی بات کما حقہ مخاطب تک پہنچ سکے۔

آپ کے سوال کا دوسرا جواب یہ ہے کہ سائنس اور نفسیات کی مجبوری یہ ہے کہ وہ صرف اسی شے کا تجزیہ کرے جو نظر آتی ہے۔ انسان کی اصل شخصیت اگر اس کے مادی جسم سے الگ کوئی غیر مرئی چیز ہے تو یہ سائنس کی گرفت میں نہیں آ سکتی، اس لیے وہ اس کے بارے میں کوئی حکم لگانے کی پوزیشن میں بھی نہیں ہے۔ انسانی دماغ ایک مادی چیز ہے، لہٰذا سائنس دانوں نے اس کا مطالعہ کر کے حیرت انگیز چیزیں دریافت کی ہیں۔ آپ کی یہ بات بالکل درست ہے کہ وہ جسم اور ذہن کی دوئی کے بجائے وحدت کے تصور کے قائل ہیں، لہٰذا وہ دماغ ہی کو تمام فکری یا نفسیاتی اعمال کا مرکز قرار دیتے ہیں۔ سائنس دانوں کی اس مجبوری کو ہم مان لیتے ہیں اور ان کی ان دریافتوں کو بھی درست قرار دینے میں فی الحال کوئی حرج نہیں ہے۔ اصل سوال یہ ہے کہ کیا قرآن بھی اسی وحدت کا قائل ہے۔ اس کا جواب اثبات میں ہے۔ دیکھیے موت کے واقعے کو بیان کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے:

وَلَوُ تَرٰٓی اِذِ الظّٰلِمُوۡنَ فِیۡ غَمَرٰتِ الۡمَوۡتِ وَالۡمَلٰٓئِکَةُ بَاسِطُوۡٓا اَیۡدِیۡهِمۡ اَخۡرِجُوۡٓا اَنۡفُسَکُمۡ اَلۡیَوۡمَ تُجۡزَوۡنَ عَذَابَ الۡهُوۡنِ بِمَا کُنۡتُمۡ تَقُوۡلُوۡنَ عَلَی اللّٰهِ غَیۡرَ الۡحَقِّ. (الانعام ۶:۹۳)

''اور اگر تم دیکھ پاتے اس وقت کو جب یہ ظالم موت کی جان کنیوں میں ہوں گے اور فرشتے ہاتھ بڑھائے ہوئے مطالبہ کر رہے ہوں گے کہ تم اپنی جانیں ہمارے حوالے کرو۔ آج تم ذلت کا عذاب دیے جاؤ گے، اس لیے کہ تم اللہ پر ناحق تہمت جوڑتے تھے۔''

اس آیت میں واضح ہے کہ موت جسم سے کسی شے کے الگ ہونے کا نام ہے۔ سائنس دان کے نزدیک موت اس کے سوا کوئی چیز نہیں ہوسکتی کہ اس جسم کی مشینری کسی سبب سے بند ہوگئی ہے۔ بہر حال جس چیز کے لیے قرآن نے جان کا لفظ بولا ہے، وہ اس جسم سے الگ ایک چیز ہے۔ ظاہر ہے جسم ہی کی طرح اس کے بھی کچھ افعال و اعمال ہیں۔ معلوم یہی ہوتا ہے کہ یہ اپنے افعال و اعمال کے لیے اسی جسم کو استعمال کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب یہ اس جسم سے الگ ہوتی ہے تو اس کے اعمال و افعال کا سلسلہ بھی منقطع ہو جاتا ہے۔

جدید ماہرین کو جسم کی یہی کارکردگی نظر آتی ہے اور وہ اپنی محدودیت کے باعث اسی کو کل سمجھنے پر مجبور ہیں۔ ہم بھی سائنس کی حاکمیت کو ضرور مان لیتے، لیکن اللہ تعالیٰ کے واضح بیان کی روشنی میں ہم سائنس دانوں کے اس فیصلے کی تغلیط کرتے ہیں۔

جب ہم نے یہ مان لیا کہ انسانی شخصیت کے دو حصے ہیں تو اب سوال یہ ہے کہ ان دونوں کی یکجائی کی نوعیت کیا ہے؟ کیا جان پورے جسم میں سرایت کیے ہوئے ہے یا یہ کسی ایک جگہ سے سارے جسم کو استعمال کرتی ہے۔ قرآن مجید میں اس کے بارے میں کوئی بات بیان نہیں ہوئی۔ البتہ اس میں یہ بات ضرور بیان ہوئی ہے کہ قلب کہاں ہے۔ سورۂ احزاب میں ہے:

مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنۡ قَلۡبَیۡنِ فِیۡ جَوۡفِهٖ. (۳۳:۴)

''اللہ نے کسی آدمی کے سینے میں دو دل نہیں بنائے۔''

اسی طرح سورۂ حج میں ہے:

اَفَلَمۡ یَسِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ فَتَکُوۡنَ لَهُمۡ قُلُوۡبٌ یَّعۡقِلُوۡنَ بِهَآ اَوۡ اٰذَانٌ یَّسۡمَعُوۡنَ بِهَا فَاِنَّهَا لَا تَعۡمَی الۡاَبۡصَارُ وَلٰکِنۡ تَعۡمَی

''کیا یہ لوگ ملک میں چلے پھرے نہیں کہ ان کے دل ایسے ہو جاتے کہ یہ ان سے سمجھتے یا ان کے کان ایسے ہو جاتے کہ یہ ان سے سنتے، کیونکہ آنکھیں اندھی

اَلْقُلُوْبُ الَّتِیْ فِی الصُّدُوْرِ. (۲۲:۴۶) نہیں ہوتی، بلکہ وہ دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں میں ہیں۔''

میرا رجحان یہ ہے کہ یہ دونوں آیتیں قلب کے محاورۃً استعمال ہونے کے تصور کی نفی کرتی ہیں۔ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہی دل جو سینے میں ہے، کچھ اعمال کا محمل ہے۔اس رجحان کی وجہ یہ ہے کہ اگر حقیقت اس کے برعکس ہوتی، یعنی دماغ ہی سارے افعال واعمال کا مرکز ہوتا تو قرآن مجید میں دل کا لفظ تو استعمال ہوتا،لیکن اس کے بارے میں اس طرح کے تصریحی جملے نہ ہوتے۔

مثال کے طور پر قرآن کے زمانے میں زمین کو ساکن اور سورج کو اس کے گرد چکر لگانے والا سمجھا جاتا تھا۔قرآن مجید نے اس تصور کی کہیں تردید نہیں کی،لیکن جب اجرام فلکی کا ذکر کیا تو سب کے بارے میں کہا کہ وہ اپنے اپنے مدار میں گرداں ہیں۔دل کے معاملے میں بھی یہی ہونا چاہیے تھا۔جب اس کی عملی حقیقت کو بیان کیا جاتا تو اسے دماغ سے منسوب کیا جاتا۔

ان آیات سے اس سوال کا جواب بھی مل جاتا ہے کہ انسان کی اس صلاحیت کا مرکز کہاں ہے۔جب قرآن یہ کہتا ہے کہ اصل میں وہ دل اندھے ہوتے ہیں جو سینوں میں ہیں تو وہ یہ بات واضح کر دیتا ہے کہ اصل میں انسان جو فیصلے کر رہا ہے، اس کی حق قبول کرنے کی صلاحیت اس کے دل کے صحیح کام کرنے پر منحصر ہے۔دماغ کے عمل اور دل کے عمل کے فرق کی نوعیت وہی ہے جو مشین کے عمل اور آپریٹر کے عمل کے فرق کی ہے۔یہ درست ہے کہ پروڈکشن دماغ ہی میں ہوتی ہے جسے سائنس دان دیکھتے ہیں،لیکن اس کو وجود میں لانے والی شے اور ہے۔

اسکول کے بچوں کو جنسی تعلیم

سوال: ہائی اسکول کے بچوں کو سیکس کی تعلیم دینے سے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟ اسلامی شریعت اس کے بارے میں کیا کہتی ہے؟ (شاہ زیب خان)

جواب: بچوں کی تعلیم کے دو مقاصد ہیں: ایک دینی اور ایک دنیوی۔دینی مقصد یہ ہے کہ بچے اپنے دین سے اچھی طرح آگاہ ہوں۔انھیں معلوم ہو کہ اصل میں یہ دنیا امتحان کی جگہ ہے جو اس میں کامیاب ہوگا، وہ آخرت میں اجر پائے گا اور جو اس میں ناکام ہوگا، اسے سزا ملے گی۔دین کی تمام تعلیمات دراصل اسی امتحان میں کامیابی کو پیش نظر

رکھ کر دی گئی ہیں۔

دنیوی مقصد دو ہیں: ایک یہ کہ بچے اپنے بڑوں کے علم، عمل اور روایات کے امین بنیں اور دوسرا یہ کہ وہ اپنی زندگی گزارنے کے لیے کوئی صلاحیت پیدا کر لیں۔

جنس کی تعلیم ظاہر ہے اس دنیوی مقصد ہی کے ذیل کی چیز ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس حوالے سے ٹوٹکوں، معالجوں اور تصورات کی صورت میں بہت سی غلط چیزیں رائج ہیں اور اس کے لیے مناسب رہنمائی کا اہتمام ہونا چاہیے۔

رہا دین تو وہ ہمیں ہماری دنیا کے مسائل کا حل سکھانے نہیں آیا۔ اس میں ہمیں اپنی عقل پر اعتماد کرنا ہے۔ اوپر بیان کردہ دونوں مقاصد کو سامنے رکھتے ہوئے ہمیں ہی طے کرنا ہے کہ سیکس کی تعلیم کا مناسب وقت اور تدبیر کیا ہے۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ اسکول کے بچوں کو یہ تعلیم اپنے اندر کچھ مفاسد رکھتی ہے۔ اس کے لیے کوئی دوسری صورت اختیار کرنی چاہیے۔

سید لڑکی کی کسی غیر سید سے شادی

سوال: کیا ایک سید لڑکی کی غیر سید سے شادی ہو سکتی ہے حالانکہ سید زکوٰۃ نہیں لے سکتا۔ اگر یہ شادی ہو جائے تو ان کے بچوں کا کیا ہوگا۔ اگر وہ مستحق ہوں تو کس بنا پر زکوٰۃ لیں گے، اس لیے کہ وہ غیر سید کی اولاد ہیں جبکہ روز قیامت انھیں ماں ہی کے نام سے پکارا جانا ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک ہی خاندان میں متضاد قواعد رائج ہوں۔ ان بچوں کو سید کہا جائے گا یا نہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان کی خصوصی تکریم ہے۔ بچوں میں والد اور والدہ، دونوں کی خصوصیات منتقل ہوتی ہیں۔ ان بچوں کی حیثیت کیا ہے؟

(عزیز عالم شاہ)

جواب: سید اور غیر سید کی باہم شادی ہو سکتی ہے۔ پچھلی صدیوں میں اس خاندان کی ہر شاخ میں یہ کام ہوتا رہا ہے اور آیندہ بھی جاری رہے گا۔ شادی نہ کرنے کا تصور برصغیر میں جاگیردارانہ کلچر کی پیداوار ہے۔ میرے علم کی حد تک عربوں میں اس طرح کا کوئی تصور نہیں تھا اور نہ شاید اب پایا جاتا ہے۔ اسلام کسی ہستی کے ساتھ وابستگی کی بنا پر کسی فضیلت کو روا نہیں رکھتا۔ جہاں تک سید ہونے کے مدعی شخص کی عزت کا تعلق ہے تو یہ مسلمانوں کی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کا مظہر ہے۔ اس سے مسلمانوں کو تو فائدہ حاصل ہوتا ہے، لیکن اس کا اس سید کو کوئی فائدہ ملنے والا

نہیں ہے۔

باقی رہا آپ کا یہ اشکال کہ سید زکوٰۃ نہیں لے سکتا، چنانچہ یہ بچے زکوٰۃ لے سکیں گے یا نہیں؟ عرض ہے کہ ہمارے نزدیک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان کو زکوٰۃ لینے سے روکنے کا سبب صدیاں ہوئیں ختم ہو چکا ہے۔ استاد محترم نے اپنی کتاب ''قانون عبادات'' میں اس ضمن میں لکھا ہے:

''دوسری یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اپنے اور اپنے خاندان کے لوگوں کے لیے زکوٰۃ کے مال میں سے کچھ لینے کی ممانعت فرمائی تو اس کی وجہ ہمارے نزدیک یہ تھی کہ اموال فے میں سے ایک حصہ آپ کی اور آپ کے اعزہ واقربا کی ضرورتوں کے لیے مقرر کر دیا گیا تھا۔ یہ حصہ بعد میں بھی ایک عرصے تک باقی رہا۔ لیکن اس طرح کا کوئی اہتمام، ظاہر ہے کہ نہ ہمیشہ کے لیے ہوسکتا ہے اور نہ اسے کرنے کی ضرورت ہے۔ لہٰذا بنی ہاشم کے فقرا و مساکین کی ضرورتیں بھی زکوٰۃ کے اموال سے اب بغیر کسی تردد کے پوری کی جاسکتی ہیں۔'' (۱۳۰)

قیامت کے روز ماں کے نام سے پکارے جانے کا معاملہ اگر یہ خبر درست ہے تو ہر انسان سے متعلق ہے اور قیامت کے ساتھ خاص ہے۔ اس سے دنیا کے معاملات میں استنباط کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

آپ کا یہ خیال درست ہے کہ ہمارے ہاں خاندان باپ کی نسبت سے طے ہوتا ہے۔ یہ ایک کلچرل مسئلہ ہے۔ اسلام نہ اسے درست قرار دیتا ہے اور نہ غلط۔

موسیقی، ولیمہ اور سنت

سوال: غامدی صاحب نے ٹی وی پروگرام میں ولیمے کے متعلق کہا تھا کہ یہ کوئی شرعی مسئلہ نہیں ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا تھا کہ لوگوں نے سنت کی غلط تاویلات کی ہیں۔ کیا میں غامدی صاحب سے پوچھ سکتا ہوں کہ سنت کا لغوی مطلب کیا ہے اور سنت نبوی سے کیا مراد ہے۔ صرف قرآن ہی کے بتانے کو سنت مان لیا جائے تو پھر حدیث کا کیا فائدہ۔ انھوں نے موسیقی کے بارے میں بھی کہا تھا کہ یہ کوئی برا عمل نہیں ہے اگر اسے صحیح استعمال کیا جائے۔ ایک تو انھوں نے موسیقی اور شاعری کو ایک ہی پیمانے میں ڈال دیا۔ پھر مجھے یہ بھی معلوم کرنا ہے کہ موسیقی کا صحیح استعمال کیا ہے؟ (طارق بن یامین)

جواب: پہلی بات تو میں یہ واضح کر دوں کہ آپ نے جن الفاظ میں استاد محترم کا مدعا بیان کیا ہے، وہ ان کے مزاج کے مطابق نہیں ہیں اور نہ ہی ان کے نقطۂ نظر کی صحیح ترجمانی کرتے ہیں۔ بہرحال ان سے آپ کی الجھن سمجھ

میں آتی ہے۔

سنت کے لغوی معنی طریقے اور راستے کے ہیں۔ اصطلاحی طور پر اس کے معنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جاری کردہ دینی طریقے کے ہیں۔ استاد محترم نے اپنی کتاب ''اصول ومبادی'' میں سنت کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے:

''سنت سے ہماری مراد دین ابراہیمی کی وہ روایت ہے جسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تجدید واصلاح کے بعد اور اس میں بعض اضافوں کے ساتھ اپنے ماننے والوں میں دین کی حیثیت سے جاری فرمایا ہے۔''

اس تعریف سے پہلے انھوں نے قرآن کے ساتھ سنت کو بھی باقاعدہ ماخذ کی حیثیت سے بیان کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''اس (دین) کے ماخذ کی تفصیل ہم اس طرح کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دین آپ کے صحابہ کے اجماع اور قولی وعملی تواتر سے منتقل ہوا اور دو صورتوں میں ہم تک پہنچا ہے:

۱۔ قرآن مجید

۲۔ سنت۔''

ان اقتباسات سے بالکل واضح ہے کہ استاد محترم صرف قرآن مجید ہی کو دین کا ماخذ نہیں سمجھتے اور سنت سے بھی اسی طرح دین اخذ کرتے ہیں جس طرح قرآن مجید سے کرتے ہیں۔ امید ہے ان اقتباسات سے آپ کے یہ اشکال دور ہو گئے ہوں گے۔

ولیمہ کے بارے میں یہ اختلاف ہمیشہ سے ہے کہ یہ کوئی مستقل دینی حکم ہے یا نہیں۔ فقہ کی مشہور کتاب ''بدایۃ المجتہد ونہایۃ المقتصد'' میں فقہی آرا کا خلاصہ ان الفاظ میں منقول ہے:

''ایک گروہ نے جس میں ظاہری علما شامل ہیں، عقیقہ کو واجب قرار دیا ہے۔ جمہور نے اسے سنت کہا ہے۔ امام ابوحنیفہ اسے فرض مانتے ہیں نہ سنت۔ ان کی بات کا ماحصل یہ ہے کہ یہ نفل ہے۔''

استاد محترم کی رائے امام ابوحنیفہ کے موافق ہے۔ وہ بھی اسے ایک نفلی قربانی سمجھتے ہیں۔

موسیقی کے حوالے سے آپ کا اشکال یہ ہے کہ موسیقی کا صحیح استعمال کیا ہے۔ گویا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ موسیقی کی رائج صورتوں میں تو قباحت ہی قباحت نظر آتی ہے۔ یہ درست ہے کہ گانوں کی شکل میں جو موسیقی ہر جگہ سنی اور سنائی جا رہی ہے، اسے قابل قبول قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ہمارے نزدیک بھی اس طرح کی موسیقی سے پرہیز ہی کرنا چاہیے، لیکن دین کے ایک عالم کو اصولی بات بھی بتانا پڑتی ہے۔ اصولاً موسیقی کو ناجائز قرار دینے کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ البتہ موسیقی کے عمومی استعمال میں جو قباحت موجود ہے، اسے سامنے رکھتے ہوئے استاد محترم ہمیشہ یہ کہتے ہیں کہ اگر استعمال درست نہ ہو تو یہ گناہ ہے۔ جائز موسیقی کی بعض صورتیں ہمارے ہاں بھی موجود ہیں۔ جیسے جنگی اور ملی

ترانے، حمدیہ اور نعتیہ کلام، اچھے مضامین کی حامل غزلیں اور نظمیں جنھیں آلات موسیقی کے ساتھ اور فن موسیقی کے مطابق گایا جاتا ہے، موسیقی کے صحیح استعمال کی مثالیں ہیں۔

شاعری اور موسیقی دو الگ الگ فن ہیں، لیکن ان کو یکجا بھی پیش کیا جاتا ہے، اس لیے ان کا ذکر ایک ساتھ ہو جاتا ہے۔ ان میں ایک اور حوالے سے بھی مشابہت ہے۔ موسیقی کی طرح شاعری بھی ایک فن لطیف ہے۔ جس طرح شاعری میں اعلیٰ اور ادنیٰ، علمی، عاشقانہ اور سماجی معاملات نظم کیے جاتے ہیں اسی طرح موسیقی بھی عمدہ اور کم تر مظاہر رکھتی ہے۔ جس طرح شاعری کی بعض صورتیں گناہ ہیں۔ اسی طرح موسیقی کی بعض صورتیں بھی گناہ ہیں۔ غرض یہ کہ فنون لطیفہ تلوار کی طرح ہیں۔ استعمال کرنے والا چاہے تو اسے جہاد میں استعمال کر کے جنت خرید لے اور چاہے تو اسے کسی بے گناہ کو قتل کر کے جہنم واصل ہو۔
